بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

پیامِ اقبالؒ

تاریخ انسانیت میں دو انقلاب بڑے عظیم ہیں۔ پہلا انقلاب' انسانی راہنمائی کے لئے حضرات انبیاء کرامؑ کی بعثت تھی۔ زندگی کے مسائل حل کرنے کے لئے انسان کو عقل وفکر کی صلاحیت سے نوازا گیا تھا' لیکن زندگی کے ابدی حقائق کا دریافت کر لینا اس کے بس کی بات نہ تھی اس کے لئے آئینِ فطرت میں استثناء کیا گیا اور ان حقائق کا انکشاف وحی کے ذریعے کیا گیا۔ وحیٔ حاملِ وحی کی فکری تخلیق نہیں تھی۔ اسے یہ علم' خدا کی طرف سے براہ راست عطا ہوتا تھا۔

پھر' نبی کا منصب اتنا ہی نہیں تھا کہ وہ خدا کی طرف سے یہ علم پاتا تھا یا اس علم کو دوسروں تک پہنچا دیتا تھا اور بس۔ وہ اس علم کی روشنی میں انسانوں کی راہنمائی کرتا تھا' ان کے معاملات کو سلجھاتا تھا۔ انہیں مل جل کر رہنے سہنے کے طور طریق سکھاتا تھا۔ راہنمائی کا یہ طریق' انسانی دنیا میں پہلا انقلابِ عظیم تھا۔

اور دوسرا انقلاب ختم نبوت تھا۔ انسانی زندگی کے لئے جس قدر اصولی ہدایات کی ضرورت تھی اسے مکمل اور غیر متبدل شکل میں عطا کر دیا گیا اور اس ضابطۂ ہدایت کی حفاظت کا ذمہ خود خدا نے اپنے اوپر لے لیا۔ انسانوں کو خدا کی طرف سے براہ راست جو علم ملنا تھا' وہ آخری مرتبہ مل گیا۔ اس کے بعد' اس ذریعۂ علم کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا گیا۔۔ باقی رہا نبی کا دوسرا فریضہ۔ یعنی آسمانی ہدایت کی روشنی میں انسانوں کی حیات اجتماعیہ کی تشکیل اور ان کے معاملاتِ زندگی کا حل۔ سو یہ فریضہ اس امت کے سپرد کر دیا گیا جسے قرآن نے ''خیر امت'' کہہ کر پکارا' اور اسے ''وارثِ کتاب'' قرار دیا۔ یعنی اب اصولی طور پر انسانی راہنمائی کے لئے' خدا کی مکمل' غیر متبدل' محفوظ کتاب (قرآن کریم) اور اس کی روشنی میں عقل وفکر اور علم وبصیرت کو کافی قرار دے دیا گیا اور زندگی کے عملی نظام کی ذمہ داری اس امت کے سپرد کر دی گئی جسے کہہ دیا گیا کہ اپنے معاملاتِ حیات (اس کتاب عظیم کی چار دیواری کے اندر رہتے ہوئے) باہمی مشورہ سے طے کر لیا کرو۔ بالفاظِ دیگر' ختم نبوت کا عملی مفہوم یہ تھا کہ اب انسان' انفرادی اتھارٹی سے بے نیاز ہو گیا اور اشخاص کے بجائے امتوں کا زمانہ آ گیا۔ تاریخ انسانیت میں یہ انقلاب بھی بڑا عظیم انقلاب تھا۔ اس

سے انسانیت ایک نئے دور میں داخل ہوگئی۔

رسول اللہ ﷺ کی حیات ارضی کے بعد' امت نے اس نظام کو قائم رکھا جس کی بنیاد نبی اکرم ﷺ کے مقدس ہاتھوں سے رکھی گئی تھی۔ آپ دیکھیں گے کہ جب تک وہ نظام قائم رہا' امت کے پاس ایک ہی کتاب تھی (یعنی قرآن کریم)۔ کوئی اور کتاب نہیں تھی جس کی طرف راہنمائی کے لئے رجوع کیا جائے۔ اس کا ایک ہی نظام تھا جس کے فیصلے ہر ایک کے لئے واجب التسلیم تھے اور امت' امت واحدہ تھی۔ اس میں کوئی فرقہ نہیں تھا' کوئی پارٹی نہیں تھی۔ اس کے بعد جب اس نظام کا شیرازہ بکھر گیا تو امت کی مرکزیت ختم ہوگئی۔ اب ایک اتھارٹی کی جگہ متعدد اتھارٹیز وجود میں آ گئیں۔ ایک کتاب کی جگہ متعدد کتابوں نے لے لی اور امت کے بجائے متعدد فرقے ظہور میں آ گئے۔ رفتہ رفتہ' خدا کی کتاب عظیم' محض تلاوت بغرض حصول ثواب باقی رہ گئی اور اسلام' دین (نظام حیات) کے بجائے مذہب بن گیا۔ انفرادیت' ملوکیت' مذہبی پیشوائیت' رہبانیت' قارونیت' سب اسی شجرۃ الزقوم کے برگ و بار ہیں۔ اگر آسمانی سلسلۂ رشد و ہدایت کے پروگرام کا آغاز اور اس کا اختتام' انسانی تاریخ کے عظیم انقلابات تھے' تو اسلام میں یہ تغیر بھی کچھ کم تحیر انگیز نہیں تھا۔ اس تغیر سے امت مسلمہ اسی مقام پر پہنچ گئی جس مقام پر' بعثت محمد ﷺ کے وقت' سابقہ اہل کتاب پہنچ چکے تھے۔ سابقہ اہل کتاب کو اس حالت سے نکالنے کے لئے' نبی آ جاتا تھا لیکن اس امت کے لئے یہ صورت بھی باقی نہیں رہی تھی۔ باب نبوت بند ہو چکا تھا لیکن سابقہ امتوں اور اس امت میں فرق یہ تھا کہ اس امت کے پاس خدا کی کتاب اپنی اصلی اور غیر محرف شکل میں موجود تھی اس لئے اسے کسی نبی کی ضرورت نہیں تھی۔ اس کے لئے کرنے کا کام یہ تھا کہ یہ خدا کی اس کتاب کو وہی مقام دے دیں جو اس کا حقیقی مقام تھا۔ یعنی معاملاتِ حیات میں اسے آخری سند و حجت قرار دے دیں اور اس کے مطابق' اپنا نظامِ زندگی متشکل کر لیں۔ یہ اس امت کے اپنے کرنے کا کام تھا۔ اس کے لئے اسے کسی خارجی سہارے کی ضرورت نہیں تھی۔

اقبالؔ کا عظیم کارنامہ یہ ہے کہ اس نے امت کی توجہ اس فراموش کردہ حقیقت کی طرف مبذول کرائی اور اسے قرآن کے صحیح مقام سے آشنا کرایا۔ آپ ان کے کلام کا اس زاویۂ نگاہ سے مطالعہ کیجئے۔ آپ دیکھیں گے کہ وہ شروع سے اخیر تک اس پیغام کو دہرائے چلے جاتے ہیں۔ یعنی' قرآن' نظام' مرکزیت' اجتماعیت' وحدتِ امت' حتیٰ کہ وحدتِ انسانیت۔۔ ان کے کلام کا آغاز مثنوی اسرار و رموز سے ہوتا ہے۔ وہ اس میں درخشندہ الفاظ میں لکھتے ہیں:

تو ہمی دانی کہ آئینِ تو چیست زیرِ گردوں سرِ تمکین تو چیست

آں کتابِ زندۂ قرآنِ حکیم
حکمتِ اُولا یزال است و قدیم

اوراس کے بعد اس کتابِ عظیم کی عظمت و رفعت اس انداز سے سامنے لاتے ہیں کہ انسان کی روح وجد میں آ جاتی ہے۔ اقبالؔ شناس حضرات کی طرف سے یہ سوال اٹھایا جاتا ہے کہ فکرِ اقبالؔ کا سرچشمہ کیا تھا۔ اس سوال کا جواب اقبالؔ نے خود (اس مثنوی کے آخر میں) اس دعا کی تشکیل میں دے دیا تھا جس سے زیادہ اثر انگیز دعا شاید ہی کوئی اور ہو۔ اس میں انہوں نے کہا تھا کہ:

گر دلم آئینۂ بے جوہر است ور بحرفم غیر قرآں مضمر است
تو۔۔۔ روز محشر خوار و رسوا کن مرا بے نصیب از بوسۂ پا کن مرا
اور۔۔۔ گر ور اسرار قرآں سفتہ ام با مسلماناں اگر حق گفتہ ام
تو۔۔۔ درعمل پائندہ تر گرداں مرا آبِ نیسا نم گہر گرداں مرا

اوراس حسین آغاز کے بعد، وہ تمام عمر امت کی توجہ اسی کتابِ عظیم کی طرف مبذول کراتے رہے۔ فکرِ اقبالؔ کے کئی گوشے ایسے ہیں جن سے اختلاف کیا جا سکتا ہے۔ ایسے مقامات بھی ہیں جہاں ان کے پیش کردہ نکات میں تضاد بھی پایا جاتا ہے کہ ان کی فکر بالآخر ایک انسان کی فکر تھی جس میں سہو و خطا بھی ہوتا ہے اور بالیدگی و ارتقاء بھی۔ لیکن جو کچھ انہوں نے قرآن کے متعلق کہا ہے اس میں نہ گنجائشِ اختلاف ہے نہ شائبہ تضاد۔ ایک ہی پیغام ہے جسے وہ مختلف انداز سے دہراتے چلے جاتے ہیں۔ کہیں اس انداز سے کہ

چوں مسلماناں اگر داری جگر در ضمیرِ خویش و در قرآں نگر
صد جہانِ تازہ در آیاتِ اوست عصر ہا پیچیدہ در آناتِ اوست

کہیں ان الفاظ میں کہ:

جُز بقرآں ضیغمی روباہی است فقرِ قرآں اصلِ شاہنشاہی است
چیست قرآں خواجہ را پیغامِ مرگ دستگیرِ بندۂ بے ساز و برگ

اور۔۔۔ اس سے ذرا آگے ہے۔

فاش گویم آنچہ در دل مضمر است ایں کتابے نیست چیزے دیگر است
چوں بجاں در رفت جاں دیگر شود جاں چوں دیگر شد جہاں دیگر شود

کہیں قرآن اور تلوار کے متعلق کہتے ہیں کہ:

ایں دو قوت حافظِ یک دیگر اند کائناتِ زندگی را محور اند

اور کہیں اس میں ایک تیسری چیز کا اضافہ ان الفاظ میں کرتے ہیں کہ:

مرد مومن را عزیز اے نکتہ رس چیست جز قرآن و شمشیر و فرس

اور بالآخر اس تمام تفصیل کو اس ایجاز میں سمیٹ دیتے ہیں کہ

گر تو می خواہی مسلمان زیستن نیست ممکن جز بقرآں زیستن

انہوں نے اپنے اشعار ہی میں اس حقیقت کو واشگاف نہیں کیا بلکہ جہاں اور جب بھی انہیں موقعہ ملا' قرآن کی اہمیت کو بہر رنگ نمایاں کرتے چلے گئے۔ اپنے بیانات میں' خطبات میں' تقاریر میں' پیغامات میں' حتیٰ کہ دوستوں اور ہمنواؤں کے نام اپنے خطوط میں' ہر تقریب اور ہر مقام پر اس پیغام کو دہراتے رہے۔ سید سلیمان ندوی (مرحوم) کے نام اپنے ایک خط میں رقم طراز ہیں۔

> قرآن کامل کتاب ہے' اور خود اپنے کمال کا مدعی ہے لیکن ضرورت ہے کہ اس کے کمال کو عملی طور پر ثابت کیا جائے کہ سیاسیات انسانیہ کے لئے تمام ضروری قواعد اس میں موجود ہیں اور اس میں فلاں فلاں آیت سے فلاں فلاں قواعد کا استخراج ہوتا ہے۔

(مولانا) حسین احمد مدنی (مرحوم) کے ساتھ اپنے مشہور ''معرکۂ دین و وطن'' میں ان سے کہتے ہیں کہ

> جو کچھ قرآن سے میری سمجھ میں آیا ہے اس کی رو سے اسلام' محض انسان کی اخلاقی اصلاح ہی کا داعی نہیں بلکہ بشریت کی اجتماعی زندگی میں ایک تدریجی مگر اساسی انقلاب بھی چاہتا ہے جو اس کے قومی اور نسلی نقطۂ نگاہ کو یکسر بدل کر اس میں خالص انسانی ضمیر کی تخلیق کرے۔

وہ اپنے ایک مقالہ میں قرآن کے پیش نظر مقصد کی تشریح ان الفاظ میں کرتے ہیں:

> قرآن کا مقصد یہ ہے کہ مسلم بہ حیثیت فرد وہ انسان بن سکے جسے وحی خداوندی احسن التقویم کے نام سے تعبیر کرتی ہے' اور ملت اسلامیہ وہ ملت بن جائے جو قرآن پاک کے الفاظ میں دنیا کی بہترین امت (خیر الامم) ہو'

قرآن کو فراموش کر دینے کا لازمی نتیجہ تقلید اور جمود تھا اس لئے کہ قرآن تو زندگی کی ہر آن حرکت کو سامنے لاتا ہے اور دین کا مقصد ہی یہ بتاتا ہے کہ وہ انسان کو اس قابل بنا دے کہ وہ عمل پیہم اور سعیٔ متواتر سے زندگی کی ارتقائی منازل طے کر سکے۔ لہٰذا' جمود و تعطل اس کے نزدیک موت کے مرادف ہے۔ اسی جمود کا نتیجہ ہے کہ وہ فقہی قوانین جو آج سے صدیوں پہلے' اس زمانے کے تقاضوں کے مطابق انسانی کوششوں سے وضع ہوئے تھے' انہیں وحی خداوندی کی طرح ابدی اور غیر متبدل قرار دے دیا گیا۔ اس صورت حال پر تبصرہ کرتے ہوئے' علامہ اقبالؒ اپنے خطبات تشکیلِ جدید میں لکھتے ہیں۔

مسلمانانِ ہند چونکہ غیر معمولی طور پر قدامت پسند واقع ہوئے ہیں لہٰذا ہندوستانی عدالتیں مجبور ہیں کہ فقہ اسلامی کی مستند کتابوں سے سرِ مو انحراف نہ کریں۔ اس صورت حال کا نتیجہ یہ ہے کہ لوگ تو بدل رہے ہیں مگر قانون جہاں تھا وہیں کھڑا ہے۔

اس سے ذرا پہلے لکھتے ہیں:

بدقسمتی سے قدامت پسند مسلمان عوام کو ابھی یہ گوارا نہیں کہ فقہ اسلامی کی بحث میں کوئی تنقیدی نقطۂ نظر اختیار کیا جائے۔ وہ بات بات پر خفا ہو جاتے ہیں اور ذرا ذرا سی تحریک پر بھی فرقہ وارانہ نزاعات کا دروازہ کھول دیتے ہیں۔

ان کے نزدیک' کرنے کا کام یہ تھا کہ قرآن کریم کے ابدی اصولوں کی روشنی میں ایسے قوانین مرتب کئے جائیں جو ہمارے موجودہ تقاضوں کو پورا کر سکیں۔ چنانچہ وہ اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں۔

جو شخص اس وقت قرآنی نقطۂ نگاہ سے زمانہ حال کے جورس پروڈنس (اصول فقہ) پر ایک تنقیدی نگاہ ڈال کر احکام قرآنیہ کی ابدیت کو ثابت کرے گا وہی اسلام کا مجدد ہوگا اور بنی نوع انسان کا سب سے بڑا خادم بھی وہی شخص ہوگا۔

اقبالؒ نے یہ کچھ اس زمانے میں لکھا تھا جب یہاں انگریزوں کی حکمرانی تھی اور اپنے لئے آپ قوانین مرتب کرنے کے ہمیں اختیارات حاصل نہیں تھے۔ انہوں نے ایک آزاد مملکت کا تصور ہی اس لئے پیش کیا تھا کہ ہم اس قابل ہو سکیں کہ قرآن کریم کی روشنی میں اپنے لئے ضابطۂ قوانین خود مرتب کر لیں اور اسی کے مطابق ہماری مملکت کا کاروبار سرانجام پائے۔ ظاہر ہے کہ تشکیل پاکستان کے وقت علامہ اقبالؒ زندہ ہوتے تو وہ سب سے پہلے یہی کام کرتے یا کراتے۔ لیکن ہماری بدقسمتی کہ وہ اس سے پہلے ہی ہم سے جدا ہو گئے اور اس مملکت کے ساتھ وہی کچھ ہوا جس کا انہیں خدشہ تھا کہ

زاغوں کے تصرف میں ہیں شاہیں کے نشیمن

چنانچہ یہاں ہوا یہ کہ جمود و تعطل کی گرہیں پہلے سے بھی زیادہ مضبوط ہو گئیں اور وہ حقیقی اسلام' جس کے متعلق انہوں نے (فوقؔ مرحوم کے نام اپنے ایک خط میں) لکھا تھا کہ ''وہ ہندوستان میں ایک فراموش شدہ چیز ہے'' جنس فراموش تر ہو گئی اور نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ یہ کہنا کہ ہمارے نظام و قوانین کی اساس قرآن خالص پر ہونی چاہئے' جرمِ عظیم قرار پا گیا۔ اقبالؒ نے سید سلیمان ندوی (مرحوم) کے نام اپنے ایک مکتوب میں لکھا تھا کہ:

میرے دل میں ممالکِ اسلامیہ کے موجودہ حالات دیکھ کر بے انتہا اضطراب پیدا ہو رہا ہے' یہ بے چینی اور اضطراب محض اس وجہ سے ہے کہ مسلمانوں کی موجودہ نسل بگڑ کر کوئی اور راہ اختیار نہ کر لے۔

آج یہ خطرہ اس وقت سے بھی زیادہ مہیب اور قریب تر نظر آ رہا ہے۔ اس لئے بھی کہ علامہ اقبالؒ نے' اپنی زندگی کے آخری ایام میں' مدیر احسانؔ کے نام اپنے خط میں لکھا تھا کہ:

وہ شخص جو دین کو سیاسی پراپیگنڈے کا پردا بناتا ہے' میرے نزدیک لعنتی ہے۔

(انوار اقبالؒ مرتبہ بشیر احمد ڈار۔ ص ۱۶۸)۔

اور پاکستان میں آج یہ کھیل کھلے بندوں کھیلا جا رہا ہے۔ لیکن اس میں مایوسی کی کوئی بات نہیں۔ قرآن' جہاں زمان و مکان کی حدود سے مستغنی ہے وہاں وہ کسی خاص ملک اور قوم سے بھی وابستہ نہیں۔

وان تتولوا یستبدل قوما غیر کم۔ ثم لا یکونوا امثالکم۔ ﴿۴۷/۳۸﴾۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

یادِ رفتگان

داعیانِ الی القرآن

حافظ سید محبّ الحق صاحب مرحوم!

''ہم کہہ دیں گے کہ ہم کو قرآن ہی ملا اور وہی قرآن ہم لے کر آئے ہیں''

سفر آخرت کی تیاری ہو رہی ہے اور مسافر زاد راہ تیار کر رہا ہے۔

خوش آں راہی کہ سامانے نہ گیرد

کے نشہ میں سرشار مسافر کی نگاہ میں دنیا کا کوئی سامان نہیں جچتا اور اس کی روح کی گہرائیوں سے آواز اٹھتی ہے:

حسبنا کتاب اللہ

وہ اپنے منتہا کو دیکھتا ہے' اسے یقین ہو چکا ہے کہ کوئی وقت جاتا ہے کہ اس کی آنکھ اس جہان آب وگل پر بند ہو جائے گی اور اس عیشتہ راضیہ پر کھلے گی جس کا قرآن میں وعدہ کیا گیا ہے۔ اس کا نفس مطمئنہ اپنے آپ کو اپنے رب کے حضور میں محسوس کرتا ہے اور پورے یقین اور ایمان سے پکار اٹھتا ہے کہ

ہم کو قرآن ہی ملا اور وہی قرآن ہم لے کر آئے ہیں!

ڈاکٹر تھارانی روڈ پر حسن منزل (کراچی) میں ایک مرد درویش رہا کرتے تھے۔ خوبصورت' نورانی چہرہ' سفید گھنی کھلی داڑھی' نوے سال سے اوپر کا سن عمر کے تقاضے سے جسم مجموعۂ امراض بن چکا تھا۔ بصارت قریباً جواب دے چکی تھی' سماعت نہ ہونے کے برابر تھی۔ لیکن جسمانی عوارض کے باوجود ذہنی مستعدی اور قلبی حضور کا یہ عالم تھا کہ جو ارادت کیش مزاج پرسی کے لئے حاضر ہوتے ان کے مضطربانہ سوالات کے جواب میں نہایت اختصار سے یوں فرماتے کہ نیند بھی نہیں آئی' کچھ کھا بھی نہیں سکا' اختلاج بھی ہو گیا' وغیرہ' لیکن اللہ کا فضل ہے۔۔ اور اس کے بعد سلسلہ کلام کچھ اس طرح شروع ہو جاتا کہ دیکھئے' ہم بیٹھے بیٹھے قرآن کے فلاں مقام پر یوں غور کر رہے تھے۔ اگر اس میں کچھ اشکال محسوس ہوتا تو بلاتکلف سامع کی رائے پوچھتے ورنہ اپنے خیال کا اظہار کرتے اور اس انداز سے گفتگو جاری رہتی کہ پرسانِ حال یہ سمجھتے کہ آپ کے مزاج بحمداللہ بخیر ہیں۔

یہ تھے شمس العلماء حافظ سید محبّ الحق صاحب

رئیس پٹنہ۔

☆☆☆

آپ شاہوبیگہ، ضلع گیا (بہار) میں پیدا ہوئے۔سن پیدائش قریباً ۱۸۵۵ء تھا۔ چونکہ آپ کے والد بزرگوار سید فدا حسین صاحب اسی گاؤں میں مقیم تھے اس لئے آپ کے بچپن کا زمانہ اسی گاؤں میں گذرا۔ایک قاری محمد جان صاحب کو انہیں قرآن مجید حفظ کرانے کے لئے مقرر کیا گیا۔قاری صاحب لکھو کے رہنے والے تھے لیکن وہ تین سال تک ان کے پاس شاہوبیگہ میں رہے۔ قاری صاحب قرأت میں غیر معمولی شہرت رکھتے تھے، یہاں تک کہ ان کے حسن قرأت کی وجہ سے مشہور تھا کہ ان کے پاس جن پڑھنے کے لئے آتے ہیں۔ وہ جب سید صاحب کے پاس آتے تو آتے ہی کہتے: ہاں بھئی حافظ صاحب سناؤ! جب ان کا شاگرد انہیں بے تکلف قرآن سنا دیتا تو فرط محبت سے ان کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو جاتے۔ تین سال کے بعد جب آپ لکھو واپس چلے گئے تو ایک نابینا حافظ فضل حسین صاحب حفظ قرآن پر مقرر کئے گئے۔ ان قاری صاحب کا حافظہ بلا کا تھا اور قرآن اس صحت اور روانی سے یاد تھا کہ جب بھی ان سے پوچھا جاتا کہ فلاں آیت کس مقام پر ہے تو نہایت بے تکلفی سے فوراً صحیح بتا دیا کرتے تھے۔

جب حافظ صاحب کی عمر کوئی ۲۳ یا ۲۴ برس کی ہوئی تو آپ عظیم آباد (پٹنہ) تشریف لے گئے۔ وہاں پر آپ نے عربی کی تعلیم حاصل کی۔ وہیں ایک بڑے رئیس مولوی مشیر علی صاحب کی نواسی۔۔سے آپ کی شادی بھی ہوگئی تو آپ نے پٹنہ ہی میں مکان بنوا کر مستقل رہائش اختیار کر لی۔تین چار سال میں ان کی بیگم کا انتقال ہوگیا۔ ان کے بطن سے ایک لڑکی پیدا ہوئی تھی وہ بھی فوت ہوگئی آپ کے چچا سسر کا نام سید رضا حسین تھا جو وہاں کے ''سرسید'' مشہور تھے۔

آپ کی دوسری شادی سید عبدالعزیز کی ہمشیرہ سے ہوئی۔سید عبدالعزیز صاحب پٹنہ کے مشہور لیڈر تھے اور مخدوم راستیؒ کی اولاد میں سے تھے۔

اب حافظ صاحب کا رجحان تصوف کی طرف ہونا شروع ہوگیا۔ آپ کی عمر کوئی تیس برس کی ہوگی کہ ایک بزرگ حاجی خدا بخش صاحب جو کہ غازی پور کے رہنے والے تھے اور دہلی میں مقیم تھے، پٹنہ تشریف لائے۔ایک دن اتفاقیہ حافظ صاحب کی ان سے ملاقات ہوگئی تو آپ نے دیکھا کہ لوگ آ آ کر حاجی صاحب سے قرآن کے مطالب پوچھتے ہیں۔ حافظ صاحب نے بھی عرض کیا کہ اگر آپ خدا کی راہ بتاتے ہیں تو میں بھی آپ کے پاس آیا ہوں۔ حاجی صاحب نے جواب دیا کہ اللہ کی راہ قرآن میں ہے اور ''تمہارے پاس قرآن موجود ہے''۔حافظ صاحب فرماتے ہیں کہ ''جب بھی ان سے کچھ پوچھا جاتا تو حاجی صاحب

یہی جواب دیتے کہ تمہارے پاس قرآن موجود ہے۔''

حافظ صاحب پہلے ہی سے قرآن کی طرف راغب تھے۔ حاجی صاحب کے جواب سے ان کے رجحان کو اور تقویت ملی۔ آپ کے بیان کے مطابق ان کے پیر صاحب بیعت نہیں لیا کرتے تھے بلکہ صرف قرآن پڑھنے اور اس پر عمل کرنے کی تلقین فرمایا کرتے تھے۔ اس سے ان کا قرآن میں استغراق اس قدر زیادہ ہوگیا کہ بتدریج کسی اور کتاب کی طرف توجہ ہی نہ رہی' نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ جب ۱۹۴۰ء میں محترم پرویز صاحب نے ان کی طرف خط لکھا اور ایک حوالہ دریافت کیا تو آپ نے جواب دیا:

''میں نے اپنی کل کتابیں حدیث وتفسیر سب ہی مدرسہ شمس الہدیٰ میں دے ڈالی تھیں اور صرف قرآن کو اپنا نصب العین بنایا تھا کہ بس قرآن ہی کافی ہے..... میری کل تصنیفوں کی بنیاد صرف قرآن پر ہے..... میرا اس انہتر کو پہنچا۔ اپنے حافظہ پر اعتماد نہیں رہا۔ کتابیں قرآن کے سوا کوئی میرے پاس نہیں۔ (۲۱ اگست ۱۹۴۰ء)

☆☆☆

آپ کی سب سے اولیں تصنیف ایک رسالہ ''میلاد النبیؐ'' ہے۔ یہ ۹۲ صفحات کا رسالہ بہت مقبول ہوا اور کئی بار شائع ہوا۔ گو بعد میں آپ فرمایا کرتے تھے کہ ''یہ میرے ایام جاہلیت کی تصنیف ہے'' تاہم اس کی بہت قدر کی گئی۔ یہ رسالہ حیدر آباد (دکن) میں بھی شائع ہوا تھا۔ پٹنہ کے ایک پادری ڈین صاحب نے' جن کے ذمہ ڈسٹرکٹ سکولوں کے لئے نصاب تعلیم کی کتابوں کا انتخاب تھا' دیکھ کر کہا:

ہم نے پیغمبر اسلام کے حالات بہت پڑھے لیکن اس جیسی کتاب نہیں دیکھی۔

سر علی امام پٹنہ کے مشہور بیرسٹر حافظ صاحب کے بھانجے تھے۔ ایک مرتبہ انہوں نے آپ کو اپنے ہاں دعوت پر بلایا۔ دوران گفتگو کہنے لگے کہ اگر آپ اجازت دیں تو میں بے تکلف ہو کر آپ سے گفتگو کروں کیونکہ میں بعض سوالات کے تشفی بخش جواب چاہتا ہوں۔ آپ کے اجازت دینے پر سر علی امام کہنے لگے کہ قرآن مجید کی حقانیت کے لئے صرف اتنا ہی کہہ دینا کہ اس جیسی ایک سورت بنا لاؤ کچھ سمجھ میں نہیں آتا کیونکہ سعدی کی گلستاں اور ہومر کی کتاب اور اسی طرح کی کئی کتابیں ہیں کہ ان کے جواب کی کتابیں بھی آج تک کوئی شائع نہیں کر سکا۔ اور پھر قرآن میں کوئی تسلسل بھی نہیں۔ کہیں کچھ ہے' کہیں کچھ۔ حافظ صاحب نے اعتراض سنا اور بڑے تحمل سے جواب شروع کیا:

جیسا کہ خدا تعالیٰ کی مخلوق میں سلسلہ ہے' ویسے ہی اس کے کلام میں سلسلہ ہے' جو اس بات کا ثبوت ہے کہ قرآن خدا کا کلام ہے.....

حافظ صاحب نے ان اعتراضات کو سامنے رکھا اور ان کو

پیش نظر رکھتے ہوئے اپنی پہلی کتاب ''دعوت الحق'' تصنیف کی۔ آپ نے جب یہ کتاب سر علی امام کو دکھائی تو انہوں نے اعتراف کیا کہ ان کے سب اعتراضات کا جواب مل گیا ہے۔ اس اثنا میں آپ مسوری تشریف لے گئے۔ وہاں آپ کے پاس کالج کے دو متعلم آنے لگے۔ ان کا میلان دہریت کی طرف تھا۔ دوران گفتگو میں وہ اعتراضات کرتے اور حافظ صاحب ان کے جواب دیتے۔ یہ سلسلہ کئی دن تک جاری رہا۔ ایک دن آپنے ان سے کہا کہ اس طرح تو تمہارے سوالات ختم نہیں ہوں گے' لو یہ کتاب میں نے لکھی ہے' اسے پڑھو۔ انہوں نے بھی جب دعوت الحق کا مطالعہ کیا تو اس میں اپنے جملہ اعتراضات کا تشفی بخش جواب پایا اور دہریت سے باز آ گئے۔ اس کے بعد ''دعوت الحق'' کو شائع کر دیا گیا اور وہ بہت مقبول ہوئی۔ اس کتاب کی نظام دکن نے بھی بہت تعریف کی اور حافظ صاحب کا وظیفہ مقرر کر دیا۔ حافظ صاحب کے نظام دکن سے قریبی مراسم تھے' چنانچہ جب ملاقات ہوتی تھی تو متعدد مسائل پر گفتگو رہتی تھی۔ آپ جب بھی حیدر آباد جاتے ایک ایک دو دو ماہ قیام رہتا۔

حافظ صاحب کی تمام تصانیف اس وقت قریباً نایاب ہیں۔ ہمیں افسوس ہے کہ دعوت الحق ہمارے بھی پیش نظر نہیں۔

دعوت الحق کے کوئی دس برس بعد ۱۳۳۹ھ میں یعنی آج سے کوئی اسی اکیاسی برس پہلے شرعۃ الحق شائع ہوئی۔ اس سلسلہ کی تیسری کتاب منہاج الحق تھی جو کوئی چھ سال بعد یعنی ۱۳۴۵ھ میں شائع ہوئی۔ حافظ صاحب پرویز صاحب کے نام اپنے ایک مکتوب گرامی میں لکھتے ہیں:

میں نے کتاب (یعنی شرعۃ الحق) لکھی' اس کو قریب قریب چالیس برس ہوئے ہوں گے۔ یہ کتاب جو علماء کے لئے ہے اور دوسری کتاب منہاج الحق جو صوفیہ کے لئے ہے۔ دونوں کتابیں دس برسوں تک لکھی لکھائی پڑی رہیں۔ میرا لڑکا بیرسٹری کے لئے ولایت گیا ہوا تھا' چھپوانے کا موقع نہ ملا اور پھر بھول چوک بھی۔ اتفاق سے میں حیدر آباد گیا۔ وہاں منہاج الحق سننے کو مجمع آتا رہا اور اس میں ہمارے دوست مولوی حمید الدین صاحب بھی آئے۔ فرمائش کر کے کچھ سنا اور کتاب کو میرے ہاتھ سے لے لیا۔ دیکھا تو ان کی نظر پڑی کہ اس کتاب کو صاف ہوئے دس برس ہو گئے۔ وہ مصر ہوئے کہ اس کو فوراً چھپنا چاہئے' ورنہ آپ مر جائیں گے اور کتاب ضائع ہو جائے گی۔ مسلمانوں کے بہت ذخیرے ضائع ہو چکے۔ انہوں نے اسی وقت کاتب کو بلا کے اس کے حوالہ کیا کہ فوراً کتاب چھپے۔ میں نے کہا کہ پروف کون دیکھے گا میں جا رہا ہوں۔ مولوی عبدالغنی مرحوم نے کہا

کہ میں دیکھوں گا غرض احباب کی زبردستی سے وہ کتاب چھپی۔ (۱۴ اگست ۱۹۴۰ء)

مولانا حمید الدین فراہی صاحب نے نہ محض مسودہ کاتب کو دلوایا بلکہ اپنی گرہ سے پچاس روپے بھی دیئے تاکہ کتاب کے چھپنے میں مزید رکاوٹ نہ ہو۔

محولہ بالا خط سے پتہ چلتا ہے کہ شرعۃ الحق اور منہاج الحق چالیس سال پہلے یعنی قریباً ۱۹۰۰ء کے لگ بھگ ضبط تحریر میں آئی تھیں۔ انیسویں صدی کا ورق الٹا جا رہا تھا۔ تاریخ کے اس نہ بھولنے والے ورق کی تحریر کا بیشتر حصہ خون مسلم کی سرخ روشنائی سے لکھا گیا تھا۔ اس صدی کے آخری حصہ نے ممالک اسلامیہ کو سکرات الموت تک پہنچا دیا۔ ہندوستان میں مسلمانوں کا سیاسی مرکز' نام نہاد مغلیہ سلطنت کی شکل میں جیسا کیسا باقی رہ گیا تھا وہ مٹ چکا تھا۔ عالم اسلامی کا مرکز خلافت عثمانیہ تھی' وہ بھی دم توڑ رہی تھی۔ اسے نیست و نابود کرنے کا فریضہ انیسوی صدی نے بیسویں صدی کے سپرد کیا۔ بیسویں صدی نے اس سرعت اور مستعدی سے اس سے سبکدوشی حاصل کی کہ اسے انیسویں کا ہی کارنامہ کہا جا سکتا ہے۔ ان پیہم صدمات سے مسلمانان عالم پر ہمہ گیر اضمحلال چھا گیا تھا۔ سیاسی شکستوں کے جلو میں ان کے علمی مراکز ختم ہو چکے تھے۔ اب ان کے پاس نہ حکومت تھی' نہ دولت' نہ علم۔ شکم خالی' قلب مردہ' دماغ تاریک' حال پریشاں' مستقبل پریشان تر۔ عالم اسلامی پر عمومی جمود تھا۔ کیا اس سین پر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے پردہ گر جائے گا؟ یا تاریخ ملت ابھی سنبھالا لے گی؟ یہ سنبھالا امر محال نظر آتا تھا۔ مسلمان سیاسی شکست سے ہی ہم کنار نہیں ہوئے تھے' وہ روح زماں کی رفاقت سے محروم ہو چکے تھے۔ وہ اپنے آپ کو ان قویٰ سے ہم آہنگ نہ کر سکے تھے جنہیں انیسویں صدی نے جنم دیا تھا۔ یہ صدی سائنسی ایجادات کے اعتبار سے بے مثال ہے۔ تاریخ انسانی میں پہلی مرتبہ انسان نے قوائے فطرت کو مسخر کرنے کا راز دریافت کیا اور آثار پیدا ہوئے کہ ہر چند کائنات لامتناہی ہے اور علیٰ قدر تناسب انسان ذرہ ناچیز ہے' لیکن وہ رموز فطرت کی عقدہ کشائی کر کے ایک زندہ فعال اور ہدایت کار عامل بن سکتا ہے۔ انسان کا شعور خودی بیدار ہو رہا تھا۔ اس انقلاب عظیم میں انسانوں کے وہ گروہ جو بدستور ماضی میں رہ رہے تھے ماضی ہی کی آغوش میں رہ گئے۔

ہر چند ان زلزلوں سے کوہ و دشت سحاب کی مانند اڑتے دکھائی دے رہے تھے' لیکن تہ سے کچھ تازہ چشمے بھی ابلتے نظر آ رہے تھے۔ ہندوستان میں سرسید للکارا کہ یہ شکست و ریخت تعمیر نو کی نوید ہے۔ انیسویں صدی کی قوت تعمیر کا یہ پیکر تخریب و تعمیر کے دیرینہ روابط کا اندازہ کر کے اٹھ کھڑا ہوا۔ ضرورت نئی زمانی قوتوں سے ہم آہنگ ہونے کی تھی۔ لیکن نظر بہ ظاہر ان نئی قوتوں نے تو مسلمانوں کو پامال کیا تھا وہ اس سے کیسے ہم آہنگی کر سکتے تھے؟ نہیں' یہ ہم

آہنگی ان اصول وقوانین سے ہونی تھی' تخریبی قوتیں جن کا ہنگامی مظہر تھیں۔ سرسید ایک ہی سہارا لے سکتا تھا اور اس کا وجدان اسے وہیں لے گیا۔ اس نے گرد آلود غلاف سے قرآن کو نکالا اور اس کا ایک ایک صفحہ کھول کر مسلمانوں کو دکھایا اور انہیں بتایا کہ اس کے ایک ایک لفظ میں زندگی کے کس قدر راز پوشیدہ ہیں۔ قرآن صدیوں سے مسلمانوں کے پاس تھا اور ہر وقت ان کے پاس رہا۔ کیا وہ واقعی انقلاب انگیز کتاب تھی؟ کیا وہ حیات انسانی کے اس اہم موڑ پر واقعی راہنمائی کر سکنے کی اہلیت رکھتی تھی؟ بے دین یورپ کے بڑھتے ہوئے سیلاب شوکت کے سامنے خس و خاشاک کی طرح بہنے والا مسلمان یہ کیسے یقین کر سکتا تھا؟

مسلمان صدیوں سے قرآن کو پس پشت ڈال چکے تھے۔ اب وہ بظاہر قرآن کا نام لیتے تھے اور درحقیقت احادیث و روایات مراد لیتے تھے۔ روایات نہ محض اساس دین بن چکی تھیں بلکہ وہ قرآن پر قاضی اور اس کی ناسخ قرار پا چکی تھیں۔ یہ عقیدہ اس قدر راسخ اور یہ ذہنیت اس قدر متشدد ہو چکی تھی کہ کسی کے ذہن میں خیال تک نہیں آ سکتا تھا کہ دین کی اساس تنہا قرآن پر رکھی جا سکتی ہے۔ مسلمان نہ محض ماضی ہی کو روایات کی عینک سے دیکھتے تھے بلکہ حال و مستقبل کو بھی اسی میزان میں تولتے تھے۔ ان کے لئے سب کچھ مقدر ہو چکا تھا جس پر ''شکر'' اور ''صبر'' کرنا چاہئے۔ فکر سے عاری اور عمل سے بیگانہ ہو کر قومیں مات کھا جاتی ہیں اور یہی مسلمانوں کے ساتھ ہوا۔ وہ اسی خوش فہمی میں مبتلا رہا جس میں کبھی بنی اسرائیل رہ چکے تھے کہ لن تمسنا النار الا ایاماً معدودہ ۔ یہ زندگی چند روزہ ہے' دوسری حیات جاوید دائمی جنت میں گزرے گی۔ انہیں جھنجھوڑنے اور حقائق زندگی سے متعارف کرانے کے لئے ضروری تھا کہ انہیں قرآن کی طرف دعوت دی جاتی' لیکن قرآن روایات کی بے شمار تہوں میں لپٹا ہوا تھا۔ کیا ان 'مقدس' تہوں کا تار و پود بکھر سکتا تھا؟ موج حیات بڑھ کر جب جوئے تند و تیز ہونے پر آئی تو پھر اس کی روانی اور جولانی کو کون روک سکتا تھا!

حافظ محبّ الحق اسی جذب اندروں کے مظہر تھے۔ آپ روایات کی پر پیچ و تار راہوں سے گزرتے ہوئے قرآن کے چشمۂ حیواں تک پہنچے اور دل کھول کر مسلمان کی تشنگی کا سامان بہم پہنچایا۔ آپ شرعۃ الحق کے ذیلی عنوان میں لکھتے ہیں:

> جس میں شریعت حقہ صرف قرآن مجید کی صریح آیتوں سے بیان کی گئی ہے اور یہ ثابت کر دیا گیا ہے کہ قرآن مجید مکمل اور مفصل ہے اور یہ بھی کہ خدائی کتاب انسانی رائے کی پابند و ماتحت نہیں ہے اور یہ بکمالہ اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی کا مظہر کامل ہے۔

غرض تصنیف بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

ان دونوں کتابوں (شرعۃ الحق اور منہاج الحق) کا مخرج قرآن مجید ہے..... مجھے قرآن مجید ہی سے سمجھانا ہے اور میں سمجھاؤں گا..... میں جانتا ہوں کہ قوم حق بینی کی نگاہ نہ ڈالے گی..... وہ قرآن مجید کے مقابلہ میں بھی اپنی آبائی روش کی جانداده ہوکر کہ ماالفینا علیه اباء نا مجھے برا بھلا کہے گی' اُمی محض کہے گی' تو کچھ بے جا اور برا نہ کہے گی.....اس کا یہ کہنا صحیح ہوگا' مگر اس کا یہ خیال صحیح نہ ہوگا کہ ایک جاہل اور امی نور حق کا مورد اور حق گو نہیں ہو سکا۔ مجھے جو کچھ بھی وہ کہے حق ہو سکتا ہے' مگر اس کا حق سے منہ موڑنا کبھی حق نہیں ہو سکتا۔ اگر وہ مجھے دیکھے گی تو ٹھوکریں کھائے گی اور اگر وہ حق کے آگے سر جھکائے گی تو نجات پائے گی۔

اس کتاب میں کئی مباحث ہیں۔ چند عنوانات سے کتاب کی نوعیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

(۱) خداوند عالم نے سارے رسولوں کے ذریعہ ایک ہی صراط مستقیم کی ہدایت کی۔

(۲) کیا ہر دین ماسبق دین کا ناسخ ہے یا مصدق؟

(۳) کیا قرآن کی آیات ایک دوسرے کی ناسخ ہیں؟

(۴) دین الٰہی میں حکم خداوندی واجب التعمیل ہے یا کسی اور کا بھی؟

(۵) اگر اطاعت قرآن مجید کی فرض ہے تو اطاعت رسولؐ کے کیا معنی؟

(۶) قرآن مجمل ہے یا مفصل' کامل ہے یا ناقص؟ محتاج تفسیر ہے یا نہیں؟

(۷) قرآن' تفسیر' حدیث' فقہ کی باہمی منزلتیں۔

اطاعت رسول کے معنی بیان کرتے ہوئے آپ اس عام عقیدہ کو زیر بحث لاتے ہیں کہ حدیث جزو دین ہے اور لکھتے ہیں:

اگر اطیعو الرسول کے یہ معنی ہوں تو خود آنحضرت صلعم پر' جو ہم پر ماں باپ سے زیادہ شفیق تھے' اپنے کل اقوال و افعال کو قرآن مجید کی طرح لکھوا جانا اور بذریعہ حفاظ اشاعت کرنا لازم ہو جائے گا تاکہ آپ کی امت اطیعو الرسول کی نافرمان نہ ہو سکے۔ اگر قرطاس اسی لئے طلب فرماتے ہوں اور لکھوا نہ سکے' تو صحابہ' خلفاء' اہل بیت اور کل مخلصین مسلمانوں کو فتوحات سے بڑھ کر ضروری اور لازم تھا کہ آپ کے اقوال و افعال کو جمع کر لیں اور آپ کے حرکات وسکنات کو قلم بند کر لیں.....تاکہ خود بھی اور سارے مسلمان بھی اطیعو الرسول کے نافرمان نہ بن سکیں۔ مگر کسی نے جمع نہ کیا۔ اگر اطیعو الرسول کے یہی معنی ہیں تو اس کا کوئی مطیع نہیں ملے

گا کیونکہ آپ کی مقدس زندگی کے سارے اقوال و افعال اور حرکات وسکنات نہ پہلے کسی کو پہنچے ہوئے تھے اور نہ اب پہنچے ہوئے ہیں۔ تو پھر اطاعت رسول کس نے کی اور کون کرسکتا ہے؟ اگر اطاعت رسول کے یہ معنی ہوتے جو لوگ سمجھتے ہیں تو صحابہؓ اس سوال میں بے باک نہ ہوتے کہ یارسولؐ اللہ یہ حکم آپ کا ہے یا خدا کا۔ اور ایسے حال میں حضرت زید رضی اللہ عنہ کبھی زینبؓ کو طلاق نہ دیتے درآنحالیکہ نبی فرما رہے تھے امسک علیک زوجک۔ اپنی بیوی کو طلاق نہ دو۔

لہٰذا

اطاعت سے مراد رسالت یعنی قرآن کے ہیں۔ یہی اطاعت خدا کے بھیجے ہوئے اور رسولؐ کے لائے ہوئے قرآن کی ہے' اور یہی ایک اطاعت دونوں کی اطاعت ہے۔ من یطع الرسول فقد اطاع اللہ۔

حافظ صاحب کی علمی تحقیقات اور تصنیفی مساعی کا نکتہ ماسکہ قرآن تھا۔ آپ نے جو کچھ لکھا وہ اپنی فہم کے مطابق قرآن ہی سے اخذ کیا۔ وہ اس مقصد کا اتنا قوی احساس رکھتے ہیں کہ قدم قدم پر قارئین کو یاد دلاتے ہیں۔ وہ قرآن میں کسی قسم کی آمیزش کے روادار نہیں۔ چنانچہ ایک بحث کے خاتمہ پر لکھتے ہیں:

چونکہ یہ میری تحقیق ہے' یعنی ایک انسانی تحقیق ہے جس میں غلطی ہوسکتی ہے' تو اس کی تحقیق مصطلحات سے' محاورات عرب سے' مذہبی تاریخ یعنی حدیث سے' یا اعمال قوم سے جس طرح چاہو کر سکتے ہو۔ مگر وہ ماخذ اسناد کی جگہ ہماری جہالت اور لاعلمی دور کرنے والے ہوسکتے ہیں' داخل دین ہوکر دین اللہ نہیں ہوسکتے' نہ قرآن مجید کی قطعیت چھین سکتے ہیں..... اگر میری تحقیق سے اتفاق نہ ہو تو آپ تحقیق کرو..... تحقیق کو میں منع نہیں کرتا..... مگر خدا کے لئے قرآن کو مجمل نہ کہو کہ یہ قرآن مجید کے خلاف ہے۔

کتاب کے خاتمہ پر مختصر سی مناجات ہے۔ عام مسلمانوں کے لئے معافی اور بخشش طلب کرنے کے بعد اپنے متعلق کہتے ہیں:

اے خدا! میری ازلی تمنا ہے کہ پرسش اعمال کے دن ہمارا نامۂ اعمال قرآن مجید ہی نکلے' اس کی شریعت کامل بھی اور اس کی روحانیت اتم بھی۔ اپنی بساط سے باہر آرزو لے کر آیا ہوں' لیکن اے خدا' مجھے نہ دیکھ' اپنے کو دیکھ۔ تو وہ کر جو تیری خدائی کے شایاں ہو' اور تیری عظمت و جلالت کے سزاوار..... تاکہ رسول معصوم صلی اللہ علیہ وسلم کی فریاد میں میرا نام نہ ہو جس وقت خود بدولت کی یہ

فریاد ہوگی: وقال الرسول یارب ان قومی اتخذوا ھذا القرآن مھجورا۔

قرآن کی طرف یہ بے باک دعوت اور قرآن اور حدیث کے باہمی تعلق کا یوں صاف صاف اور ٹھیک ٹھیک تعین مذہبی حلقوں میں تہلکہ مچا دینے کے لئے کافی تھا۔ حیدر آباد (دکن) کے 'مذہبی' امور کے افسر اعلیٰ ان دنوں حبیب الرحمٰن شیروانی تھے۔ انہوں نے اس کتاب کو گمراہی پھیلانے والی کتاب قرار دیا اور حیدر آباد سے حافظ صاحب کو جو وظیفہ ملتا تھا وہ بند کرا دیا۔ نیز انہوں نے کسی مولوی صاحب سے کچھ اعتراضات لکھوائے اور حافظ صاحب کی طرف بھجوائے کہ وہ ان کا جواب دیں۔ حافظ صاحب نے انہیں لکھا کہ:

آپ ایک جلسہ قائم کر کے علماء کو بلا لیں تو میں ان سے اس پر بحث کرنے کے لئے تیار ہوں مگر اسی شرط پر کہ قرآن سے اعراض نہ ہو۔

کون مولوی اس شرط کو منظور کر سکتا تھا! خیر' نظام نے حافظ صاحب کا موقوف شدہ وظیفہ از سر نو جاری کر دیا۔

خود حافظ صاحب نے اس مخالفت کی طرف اس انداز سے اشارہ کیا ہے جو متانت اور لطافت کا حسین امتزاج ہے۔ اپنی آخری کتاب ''بلاغ الحق'' میں ''عرض حال'' کے تحت لکھتے ہیں:

اس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ شاخسانے کھڑے کئے جائیں' وہ کھڑے کئے گئے۔ کسی کسی نے الٹ پلٹ کر کچھ دیکھا بھی تو بری نگاہ سے۔ کسی نے کہا کہ یہ اہل قرآن ہو گئے' قرآن ہی سے لکھتے ہیں' حدیث سے نہیں' اقوال علماء سے نہیں' تو ان کے کفر میں کیا کلام رہا۔ کسی نے کہا کہ منہاج الحق میں رقص مستانہ اور رسوم خانوادہ کی حمایت نہیں ملتی تو ان کے منکر خانقاہ اور کافر ہونے میں کونسی تامل کی جگہ باقی رہی..... کسی نے کہا کہ جس گھر میں یہ کتاب رہے وہ کافر کا گھر ہے۔ پوچھا گیا کہ آپ نے پڑھی بھی' فرمانے لگے پڑھی تو نہیں' اور پڑھنے کی ضرورت بھی نہیں۔ کہنے والوں نے کہا' سننے والوں نے سنا۔ جو میں نے سنا وہ اک معتبر حضرت سے سنا ہے جو میرے عقیدہ میں ثقہ ہے۔

روایت پرستوں کے نزدیک کسی روایت کی صحت کا دارومدار مفروضہ راوی کی مزعومہ ثقاہت پر ہے۔ ثقاہت کا کوئی مطلق معیار نہیں۔ چنانچہ حافظ صاحب آگے چل کر لکھتے ہیں:

جیسے کسی کے مرنے کی خبر مشہور ہوئی۔ ملاقات میں ان کے دوست نے پوچھا کہ بھئی میں نے تمہارے مرنے کی خبر سنی' سخت صدمہ ہوا۔ وہ فرمانے لگے کہ بالکل غلط ہے' دیکھ لو میں مجسم موجود ہوں۔ ان کے دوست نے کہا کہ میں نے ایک مولوی صاحب

سے سنا اور وہ آپ سے زیادہ ثقہ ہیں۔

اب ایک ''ثقہ'' مولوی صاحب کی روایت کے مقابلہ میں متعلقہ شخص کا مجسم موجود ہونا اس بات کا کیسے ثبوت ہوسکتا ہے کہ مولوی صاحب کی روایت غلط ہے اور وہ مرنہیں گیا؟ لہٰذا ثابت ہوا کہ وہ شخص جو اپنے مرنے کی خبر کی خود تردید کر رہا ہے کذاب ہے!

''بلاغ الحق'' حافظ صاحب کی آخری کتاب ہے۔ کتاب میں کہیں سن اشاعت نہیں دیا گیا۔ اس کتاب میں حدیث کی ظنیت کے مقابلہ میں قرآن کی قطعیت ثابت کی گئی ہے اور عبادات اور معاملات پر بھی کافی بحث کی گئی ہے۔ اس کتاب میں ان کے دلائل میں پختگی آ گئی ہے اور ان کا قرآن کی قطعیت پر ایمان مستحکم تر اور متشدد تر ہو گیا ہے۔ لیکن آپ کے انداز تحریر میں اس قدر توازن ہے کہ باوجود شدت تاثر کہیں جادۂ اعتدال سے منحرف نہیں ہوتے۔ مخالفین کی ایک ایک دلیل کو قرآن ۔۔ اور خود حدیث ۔۔ سے رد کرتے ہیں اور کسی بحث کو تشنہ نہیں چھوڑتے۔ وہ مخالفین کی مخالفت سے بالکل برہم نہیں ہوتے اور بدلائل ان کا جواب دیتے ہیں۔ اپنے متعلق انکا ہمیشہ یہی دعویٰ ہے کہ میں نے قرآن اور صرف قرآن پیش کیا ہے۔ قارئین کو مصنف سے اختلاف ہوسکتا ہے لیکن قرآن سے تو نہیں ہوسکتا۔ لہٰذا وہ ہر ایک کو یہی مشورہ دیتے ہیں کہ مجھ پر نکتہ چینی کرو، میری عیب جوئی کرو، لیکن قرآن کو نہ ٹھکراؤ۔ خود اس میں تفکر اور تدبر سے کام لو اور مجھے نظر انداز کر دو۔

☆☆☆

حافظ صاحب کی صحت بہ تقاضائے عمر برسوں سے خراب چلی آ رہی تھی۔ ۱۷ ستمبر ۱۹۴۰ء کے تحریر کردہ خط میں آپ نے پرویز صاحب کو لکھا:

> اس ناسازیٔ طبع نے یہ سمجھا دیا کہ اب تصنیف یا تحریر کا وقت گذر گیا۔ کچھ لکھنا چاہتا تھا مگر ضعف سے سر میں چکر، ایسے حال میں کیا لکھوں۔ بیاسی برس کا سن ہوا، قویٰ جواب دے رہے ہیں۔ دوا کیا کام کرے گی۔ سوکھے درخت میں پانی ڈالنے سے کچھ نہیں ہوگا غالب خوب کہہ گیا ہے۔
>
> دم واپسیں برسرِ راہ ہے
> عزیزو اب اللہ ہی اللہ ہے

اس کے باوجود آپ نے طلوع اسلام کی طرف ایک تحریر بھیجی جسے آپ نے بخارا اور بخار کے ضعف کے باوجود لکھا لیکن آپ میں نظر ثانی کی ہمت نہ تھی۔ اس سے پیشتر ایک خط میں جو ۲۱ اگست ۱۹۴۰ء کا لکھا ہوا ہے، آپ نے اپنی جسمانی کیفیت کو مجملاً بیان کیا اور اپنے آپ کو ''مردہ نما زندہ'' کہا لیکن اندرونی کیفیت اس پر بھی یہ تھی کہ:

> ہمت کہتی ہے کہ چل، پیری کہتی ہے کہ اب وہ دن گئے، پیچھے نہ دیکھ، آگے دیکھ۔

ان کی ہمت پیری سے برسر پیکار رہی اور آخر دم تک ان کا ساتھ دیا۔

تقسیم ہند کے بعد آپ پاکستان تشریف لے آئے اور وفات تک یہیں کراچی میں مقیم رہے اور بالآخر یہیں مدفون ہوئے۔ ان کے معتقدین ان کی خدمت میں حاضر ہوتے اور گفتگو ہمیشہ قرآن ہی سے متعلق ہوتی۔ آپ نے جب پرویز صاحب سے سنا کہ معارف القرآن (جلد چہارم) کا مسودہ تیار ہو چکا ہے اور عنقریب شائع ہو جائے گا تو آپ نے فرمایا کہ اب میں اللہ میاں کے ہاں سے Extension (عمر میں توسیع) پر ہوں۔ پہلے درخواست کی تھی کہ معارف القرآن کی دوسری اور تیسری جلد دیکھ لوں' وہ منظور ہوگئی تو اب جلد چہارم تک کی توسیع کے لئے پھر گذارش کیا ہے۔ لہٰذا اس کی تکمیل طباعت میں جلدی کرو۔ میری بینائی کا تھوڑا سا حصہ جو باقی رہ گیا ہے اسے میں نے اس کتاب کے لئے محفوظ رکھ چھوڑا ہے۔ اللہ نے ان کی یہ درخواست بھی منظور کر لی اور انہوں نے اپنی زندگی کے آخری ایام معراج انسانیت کا ایک ایک لفظ پڑھنے میں صرف فرمائے۔

۱۹۴۱ء میں جب معارف القرآن کی پہلی جلد شائع ہوئی اور پرویز صاحب نے ایک نسخہ آپ کی خدمت میں روانہ کیا تو آپ نے رسید کے خط میں تحریر فرمایا:

جہاں تک کتاب کو دیکھا اس سے تو معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح عکسی قرآن چھپنا شروع ہوا ہے' آپ نے میری عقیدت اور خیالات کا عکسی مرقع شائع فرمایا ہے۔ اس قدر اتحاد خیالات بھی کیا حیرت انگیز نہیں ہے۔ اب ان کی تعریف کرنا اپنی تعریف کرنا ہے۔ اور لا تزکوا انفسکم کے احاطہ کے اندر ممنوع ہے۔ (۲۶ ستمبر ۱۹۴۱ء)

کراچی میں پرویز صاحب اور ادارہ طلوع اسلام کے اراکین سے ملاقات میں آپ نے ایک مرتبہ فرمایا کہ میں نے جب دعوت الی القرآن کی ابتدا کی ہے تو ہمیشہ یہ خیال دامن گیر رہا کرتا تھا کہ نہ معلوم یہ آواز یہیں ختم ہو جائے گی یا اس دیئے سے آگے دیا بھی جلے گا۔ اللہ نے میری آواز سن لی میری زندگی ہی میں یہ دعوت عام بھی ہوئی اور (پرویز صاحب کی طرف دیکھ کر مسکرا کر فرمایا) اب اس کی بھی تسلی ہوگئی کہ یہ سلسلہ جاری رہے گا۔ اب میں اطمینان کی موت مروں گا۔

گذشتہ صدی کے آخر میں جب اس مرد مومن نے رجعت الی القرآن کی دعوت دی ہوگی تو اس وقت یہ دعوت کس قدر غیر مانوس اور ناآشنائے گوش ثابت ہوئی ہو گی' اور آج اس مرد مومن کی مسرتوں کا کیا ٹھکانہ ہوگا جس نے اپنی دعوت کو اپنی زندگی میں یوں عام دیکھ لیا۔ کتنی کامیاب ہے زندگی اور کتنی قابل رشک ہے یہ موت!

حافظ صاحب کی صحت برسوں سے خراب تھی۔

کراچی میں ان کی حالت اور خراب ہوگئی۔ وہ چلنے پھرنے سے معذور تھے۔ اس کے باوجود ۱۹ جون ۱۹۴۹ء کی صبح کو آپ یک لخت پرویز صاحب کے مکان پر تشریف لے گئے۔ بقول پرویز صاحب ان کا ''ظلمت کدہ قرآن کے نور سے وادی ایمن بن گیا۔'' پرویز صاحب نے جب اس زحمت کی وجہ دریافت کی اور کہا کہ مجھے اطلاع دی ہوتی تو میں خود حاضر ہو جاتا۔ تو اس پر آپ نے فرمایا کہ کئی دنوں سے یہ کھٹک پیدا ہو رہی تھی کہ ایک خادم قرآن کے پاس چل کر جانے کے ثواب سے کہیں محروم ہی نہ رہ جاؤں۔ آج یہ آرزو پوری ہوگئی۔

یہ کیفیت اسی مردِ مومن کی ہوسکتی ہے جس کی عمر قرآن میں تدبر اور اس کی تبلیغ میں گزری ہو اور اس کی زندہ تفسیر کہ قل ان صلاتی و نسکی و محیای ومماتی للہ رب العالمین۔

طلوع اسلام میں ''اسباب زوال امت'' سے متعلق سلسلہ گفتگو کا آغاز ہوا تو موضوع کی اہمیت کے پیش نظر حافظ صاحب نے بھی اس بحث میں حصہ لیا اور اپنے گراں قدر خیالات پیش کئے۔ ان کا مضمون اگست ۱۹۴۹ء کے طلوع اسلام میں شائع ہوا۔ آپ نے وہ مضمون' اسطرح تحریر فرمایا کہ ضعف بصارت کے باعث اپنے لکھے کو پڑھ نہیں سکتے تھے۔ کاغذ اور قلم لے کر لکھنا شروع کر دیا اور بلا دیکھے اپنے خیالات تحریر فرماتے چلے گئے۔

☆☆☆

مسلسل عوارض اور تقسیم ہند کے ضمنی عواقب کی وجہ سے حافظ صاحب مغفور روز بروز کمزور ہوتے چلے جا رہے تھے۔ شروع مئی ۱۹۵۰ء میں وہ لاہور تشریف لے جانے پر آمادہ ہوگئے کیونکہ خیال یہ تھا کہ وہاں کی آب و ہوا ان کی صحت پر اچھا اثر کرے گی۔ ان سے جب لاہور کا ذکر آتا تو فرماتے کہ وہاں عرشی صاحب کی قرآنی جماعت ہے' ان سے قرآن پر باتیں ہوا کریں گی۔ ۲۷ مئی کو روانگی کا خیال تھا اور تیاریاں ہو رہی تھیں کہ ان کی طبیعت زیادہ خراب ہو گئی اور پھر سنبھل نہ سکی۔ چنانچہ ۲۵۔۲۶ مئی ۱۹۵۰ء کی درمیانی شب کو رحلت فرما گئے۔ فھو فی عیشۃ الراضیہ۔

☆☆☆

حافظ صاحب کے استغراق فی القرآن کا اندازہ کچھ وہی لوگ لگا سکتے ہیں جنہوں نے ان کی تصانیف کا مطالعہ کیا ہے یا وہ خوش نصیب جنہیں ان سے شرف ملاقات حاصل ہوا ہے۔ ہر چند حافظ صاحب کی عمر انیسویں اور بیسویں دونوں صدیوں پر برابر کی تقسیم ہوگئی تھی بلکہ ایک لحاظ سے انہوں نے بیسویں صدی کو کہیں زیادہ دیکھا کیونکہ ذہنی پختگی کا زیادہ حصہ اسی صدی میں گذرا لیکن وہ درحقیقت انیسویں صدی ہی کے مظہر اور نمائندہ تھے۔ انیسویں صدی میں حافظ صاحب ہراول تھے اس عظیم تحریک (رجعت الی

القرآن) کے جو بیسویں صدی میں مسلمانوں کے فکری انقلاب کا باعث بنی۔

ہمیں افسوس ہے کہ حافظ صاحب کے حالات زندگی زیادہ تفصیل سے مہیا نہیں کئے جا سکے۔ اس کے ذمہ دار آپ خود ہیں۔ آخری ایام میں ملک غلام کبریا صاحب (امت مسلمہ والے) ان کی خدمت میں حاضر ہوئے اور چیدہ چیدہ واقعات زندگی لکھوانے کے لئے اصرار کیا تو آپ نے فرمایا کہ یہ ایک قصۂ پارینہ ہے۔ ایک گنہگار انسان ہوں اور ابھی تک جیتا ہوں' اور تمہارے سامنے ہوں' دیکھ لو۔ لکھنے کی کیا ضرورت ہے۔ حافظ صاحب نے اس قصہ پارینہ کی کڑیاں قصداً گم کیں۔ مثلاً ایک مرتبہ آپ نے اپنے صاحبزادوں کو بلایا اور ان سے کہا کہ میرے جو خطوط تمہارے پاس ہیں وہ لے آئیو۔ جب سب خطوط ان کی خدمت میں پیش کر دیئے گئے تو آپ نے ایک ایک کر کے ان کو تلف کر دیا۔ ان خطوط سے ان کے متعلق بیش قیمت معلومات مل سکتی تھیں لیکن انہوں نے ان کا نشان تک باقی نہ چھوڑا۔ یہ چند واقعات جو پیش کئے گئے بہت حد تک ملک غلام کبریا صاحب نے جمع کئے۔

☆☆☆

سطور بالا سے شمس العلماء سید حافظ محبّ الحق صاحب کی عظمت کا کچھ اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ اس دور میں اصحاب علم کو کون پوچھتا ہے؟ ملت کو ان کی احتیاج نہیں! یہ چند سطور لکھ کر حافظ صاحب کا ذکر اسلئے کر دیا گیا ہے کہ آئندہ نسلیں اگر زندگی کی اساس قرآن کو بنائیں تو وہ داعیان الی القرآن کے مبارک سلسلہ کی مختلف کڑیوں سے ناواقف نہ ہوں!

پاکستان کا مطلب کیا

لا الہ الا اللہ

شعروادب کے حوالے سے سیالکوٹ نے جہاں شاعرِ مشرق ڈاکٹر علامہ اقبال اور فیض احمد فیض کو اوجِ کمال بخشا ہے وہیں پر خالق نعرۂ پاکستان ''پاکستان کا مطلب کیا لا الہ الا اللہ'' پروفیسر اصغر سودائی (پ ۱۷ اپریل ۱۹۲۶ء) کا نام اہم ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ایک دفعہ ایک ہندو طالب علم نے طنزاً کہا کہ پاکستان کا مطلب کیا ہے میری زبان پر یہ نعرہ ''پاکستان کا مطلب کیا' لا الہ الا اللہ' جاری ہوگیا۔ ذیل میں ان کی نظم قارئین کرام کی خدمت میں پیش کی جاتی ہے۔ (مدیر)۔

شب ظلمت میں گذاری ہے اُٹھ وقتِ بیداری ہے
جنگِ شجاعت جاری ہے آتش و آہن سے لڑ جا
پاکستان کا مطلب کیا
لا الہ الا اللہ

ہادی و رہبر سرورِ دیں صاحبِ علم و عزم و یقیں
قرآن کی مانند حسیں احمد مُرسل صلِ علیٰ
پاکستان کا مطلب کیا
لا الہ الا اللہ

چھوڑ تعلق داری چھوڑ اُٹھ محمود بتوں کو توڑ
جاگ اللہ سے رشتہ جوڑ غیر اللہ کا نام مٹا
پاکستان کا مطلب کیا
لا الہ الا اللہ

جرأت کی تصویر ہے تو ہمت عالمگیر ہے تو
دنیا کی تقدیر ہے تو آپ اپنی تقدیر بنا!
پاکستان کا مطلب کیا
لا الہ الا اللہ

نغموں کا اعجاز یہی دل کا سوز و ساز یہی
وقت کی ہے آواز یہی وقت کی یہ آواز سُنا
پاکستان کا مطلب کیا
لا الہ الا اللہ

پنجابی ہو یا افغان! مل جانا شرطِ ایمان
ایک ہی جسم ہے ایک ہی جان ایک رسول اور ایک خدا
پاکستان کا مطلب کیا
لا الہ الا اللہ

تجھ میں ہے خالد کا لہو تجھ میں طارق کی نمو
شیر کے بیٹے شیر ہے تو شیر بن اور میدان میں آ
پاکستان کا مطلب کیا
لا الہ الا اللہ

مذہب ہو تہذیب کہ فن تیرا جداگانہ ہے چلن!
اپنا وطن ہے اپنا وطن غیر کی باتوں میں مت آ
پاکستان کا مطلب کیا
لا الہ الا اللہ

اے اصغر اللہ کرے ننھی کلی پروان چڑھے
پھول بنے خوشبو مہکے وقت دُعا ہے ہاتھ اُٹھا
پاکستان کا مطلب کیا
لا الہ الا اللہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پروفیسر فتح محمد ملک
چیئرمین مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد

علامہ مشرقیؒ کا فیضان

آج سے لگ بھگ ایک صدی پہلے کا کیمرج، اتوار کی صبح، کیمبرج یونیورسٹی کے نامور ماہر فلکیات، سر جیمز جینز، انجیل مقدس بغل میں دبائے کلیسا کی جانب رواں دواں ہیں کہ ان کا ایک نوجوان طالب علم موسلا دھار بارش میں راستہ روک کر پوچھتا ہے:

''آپ کا سائنسدان بھی پابندی سے چرچ جاتا ہے؟''

استاد اپنے ہونہار شاگرد کے تعجب کا راز بھانپ کر جواب دیتا ہے ''آج شام چائے میرے ساتھ پیو''۔

شام کو سر جیمز جینز اپنے متجسس طالب علم کے سامنے، سائنس اور مذہب کے تصادم کو باطل قرار دیتے ہوئے اجرام فلکی کی تخلیق، ان کی پنہائیوں، راہوں، مداروں، طوفان ہائے نور اور کششِ باہم کے حیرت انگیز نظام پر روشنی ڈالتے ہوئے بتاتے ہیں کہ:

''جب میں خدا کے تخلیقی کارناموں پر ایک سرسری نظر ڈالتا ہوں تو میری تمام ہستی خدا کے تصورِ جلال سے لرزنے لگتی ہے اور جب میں کلیسا میں سرنگوں ہو کر کہتا ہوں۔۔۔ خدا تو بہت عظیم ہے۔۔۔ تو میری ہستی کا ہر ذرہ میرا ہم نوا بن جاتا ہے۔ عام لوگوں کی صرف زبان عبادت کرتی ہے اور میری ہستی کا ہر ہر ذرہ محوِ تسبیح و تمجید ہو جاتا ہے۔ کہو عنایت اللہ خان تمہاری سمجھ میں آیا کہ میں گرجے کیوں جاتا ہوں؟''۔

اس پر عنایت اللہ خان سر جیمز جینز کو قرآنِ حکیم کی یہ آیت سناتے ہیں:

''وہ دیکھو پہاڑوں میں سفید، سرخ اور سیاہ رنگ کی تہیں۔ اسی طرح انسانوں، حیوانوں اور دیگر جانداروں کے مختلف رنگ ڈھنگ ہماری حکمت کا تقاضا ہیں اور مت بھولو کہ خدا سے صرف اہل علم ہی ڈرتے ہیں۔''

''کیا کہا خدا سے صرف اہل علم ہی ڈرتے ہیں۔ حیرت انگیز بہت ہی عجب! کیا قرآن میں یہ آیت

واقعی موجود ہے؟۔۔۔اگر ہے تو میری شہادت لکھ لو کہ قرآن ایک الہامی کتاب ہے۔''

اور یوں اس شام عنایت اللہ خان کے متلاطم دل و دماغ میں قرآن کریم کو سائنسی علوم کی روشنی میں از سرِ نو تفسیر کرنے کا خیال پیدا ہوا۔ پندرہ برس بعد ۱۹۲۴ء میں جب یہ خیال ایک توانا اور متحرک نثری اسلوب میں ''تذکرہ'' کی صورت میں جلوہ گر ہوا تو عنایت اللہ خان نے علامہ مشرقی کا نام پایا۔ ''تذکرہ کے آغاز میں لکھتے ہیں:

میرا یقین ہے کہ دنیا کے باقی پیغمبر جہاں سے آئے تھے' ایک ہی پیغام لائے تھے۔ انہوں نے اس کارخانۂ جہاں کو ایک ہی چشمِ تحیر سے دیکھا تھا۔ وہ انسان کو ایک ہی مقامِ بلند سے دیکھ کر تڑپ اٹھے تھے۔ حیرت کی بجلیاں اور علم و خبر کی سنسنیاں ان کے بدنوں میں ایک ہی راہ سے داخل ہوئی تھیں۔۔۔ جو کہا وہ سب ایک تھا۔ نوائے ساز ایک تھی۔ کلمۂ راز ایک تھا۔ بوسہ بہ پیغام ایک تھا۔ جب تک یہ محرمِ اسرار لوگ اس دنیا میں رہے اس راز کو برملا کہتے رہے لیکن ان کے بعد جب حقیقت ناشناس لوگوں نے اس کام کو سنبھالا تو لوگوں کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ پیغام خدا غلط سنا کر اپنے پیچھے صفیں کھڑی کر لیں۔ آج سطحِ زمین پر خدائے قہار کا منتقمانہ عذاب اسی ضد اور بغاوت سے ہے۔''

علامہ مشرقی کو دنیائے اسلام دنیا کے دارالعمل سے کنارہ کش غلاموں کا ہجوم نظر آئی۔ چنانچہ انہوں نے ملتِ اسلامیہ کی بے عملی کو بطورِ خاص ہدفِ تنقید بنایا۔

''مسلمانوں کی کام چور اور کم ہمت قوم نے آج عمل کی تکلیف دہ صورت کو خیر باد کہہ کر عقائد کی آرام دہ مکاری پر تکیہ کر لیا ہے اور اس مکر کے اندر ایک نیا مکر پیدا کر لیا ہے کہ نہایت عقیدت مندی سے اس بات کے درپے رہتے ہیں کہ خدا کو خوش کرنے کے لئے عقائد کو درست کیا جائے۔ اعمال کے درست ہونے پر بحث قطعاً بند ہو چکی ہے۔ گویا ہم سے ملک اس لئے چھینے جا رہے ہیں کہ حاکم زمین و آسمان کو اس لاڈلی امت کے ملفوظات پسند نہیں رہے۔۔۔ اسلام عمل اور صرف عمل ہے جو عامل ہے اس کا عقیدہ درست نہیں! بلکہ اسے زبانی عقیدے کی ضرورت ہی نہیں۔ خالی قول و عقیدہ بہر نوع کچھ بھی نہیں۔ آج کچھ نہیں' کل کچھ نہیں! ابدالآباد تک کچھ نہیں۔'' (تذکرہ' صفحہ ۸۶)۔

''تذکرہ'' کے مطالب و مفاہیم نے ن م راشد کے سے شاعروں' کرار حسین کے سے اساتذہ اور غلام جیلانی برقؔ سے علمائے دین کی زندگیاں بدل کر رکھ دیں۔ خدا کے کلام کو خدا کے کام کی روشنی میں سمجھنے کا چلن عام

ہونے لگا اور اصحابِ علم سے مردانِ عمل کا کردار ادا کرنے کی توقع روز بروز بڑھنے لگی۔ ایسے میں ایک روز ہوا یوں کہ علامہ مشرقی ''تذکرہ'' کی موعودہ (۹) نو جلدیں لکھنے کا کام چھوڑ کر سیاست میں کود پڑے۔ سیاست بڑی مبارک انسانی سرگرمی ہے۔ دین و دانش اور علم و حکمت کے شاہسواروں کو سیاسی زندگی میں ضرور سرگرم عمل ہونا چاہئے۔ علم و حکمت کا کتابوں سے نکل کر عملی زندگی کی کارگاہوں میں سرگرم کار ہونا ازبس ضروری ہے۔ مگر اس کا کیا کیا جائے کہ ہماری قومی تاریخ میں علم و حکمت نے سیاست کے میدان میں بیشتر اوقات منہ کی کھائی ہے۔ علامہ مشرقی کی سیاسی شکست ہماری قومی اور ملی زندگی کا ایک ایسا ہی بڑا المیہ ہے۔ اس سیاسی المیہ نے ہمیں ''تذکرہ'' کی سی عظیم کتاب کے نو بٹا دس حصہ سے ہمیشہ کے لئے محروم کر دیا ہے۔ خود علامہ مشرقی نے اپنی سیاسی ناکامی کا اعتراف ''آزاد ہند فوج کانفرنس'' کے اجلاس میں اپنی جون ۱۹۴۶ء کی تقریر میں ان الفاظ میں کیا ہے:

''ہمارے پیش نظر پہلے دن سے ہی غیر ملکی تسلط کا خاتمہ اور مسلمانوں کا عالمی غلبہ جس کی پہلی منزل برادر اقوام سے صلح و آشتی کے ساتھ پورے ہندوستان میں مسلمانوں کی کھوئی ہوئی سلطنت کی بحالی تھا۔''

علامہ مشرقی ایک جدید تعلیم یافتہ سائنسدان تھے۔ سیاسی بیداری اور سیاسی تنظیم کی خداداد صلاحیتوں میں اپنا ثانی نہ رکھتے تھے۔ اسلامی اخوت و مساوات اور اسلامی حریت و انقلاب کے تصورات کو اپنی ''خاکسار تحریک'' کے اراکین کی رگوں میں خون کی مانند رواں کر دینے پر قادر تھے۔ ان تمام کمالات اور اپنی نیت کے اخلاص کے باوجود فقط اس لئے ناکام ثابت ہوئے کہ ان کے خواب (آئیڈیلز) قدامت پسندانہ تھے۔ مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے وہ قرونِ وسطیٰ میں رہ رہے ہوں۔ ''مسلمانوں کا عالمی غلبہ'' اور ''ہندوستان میں مسلمانوں کی کھوئی ہوئی سلطنت کی بحالی'' ایسے خواب ہیں جن کا نہ تو اسلام کی حقیقی روح سے کوئی تعلق ہے اور نہ ہی عصر حاضر کے ذہن و ضمیر کے لئے ان میں کوئی کشش باقی رہ گئی ہے۔ سلطنتیں بزورِ شمشیر قائم کی جایا کرتی تھیں۔ سلطنتیں شہنشاہیت کا شاخسانہ تھیں۔ سلطانیء جمہور کی علمبردار قومی ریاستوں کے زمانے میں سلطنتوں کا کیا کام؟۔۔۔ ہٹلر نے بھی نیشنل سوشل ازم کا نام لے کر جرمنی میں فاشٹ سلطنت قائم کی تھی۔ مگر یہ بھی جدید ٹیکنالوجی کی تمام تر قوت کے باوجود نہ پنپ سکی۔ علامہ مشرقی کا مسلمانوں کے عالمی غلبہ کا خواب بھی اسی طرح منتشر ہو کر رہ گیا۔ علامہ مشرقی کی ناکامی میں بہت سے سبق پوشیدہ ہیں۔

سامراج دشمنی اور عوامی حاکمیت کے تصور و عمل کی حد تک علامہ مشرقی کی خاکسار تحریک بے حد کامیاب

رہی۔ اس تحریک نے برصغیر کے طول وعرض میں سامراج دشمنی اورعوام کی حکمرانی کے تصورات کا بول بالا کیا۔ جمعیت العلماء اورتحریک احرار ہی کی مانند خاکسار تحریک کا سامراج دشمن کردار ہماری تاریخ میں ہمیشہ سنہری لفظوں میں لکھا جائے گا۔ خاکسار تحریک اپنے زمانے کی تمام مسلمان سیاسی تحریکوں سے کہیں بڑھ کر سامراج دشمن تحریک ثابت ہوئی۔ پاکستان میں تحریکِ آزادی پر مسلم لیگ کی اجارہ داری قائم ہوکر رہ گئی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ برٹش راج کی بنیادیں ہلا ڈالنے کا فریضہ خاکسار کی سی انگریز دشمن تحریکوں کے سر ہے۔ اس لئے ہم پر یہ لازم ہے کہ قومی آزادی کی تاریخ قلم بند کرتے وقت ان تحریکوں کے کارناموں سے صرفِ نظر نہ کریں اور انہیں اپنا جائز حق دینے میں بخل سے کام نہ لیں۔ بقول احمد ندیم قاسمی!

اے سحر آج ہمیں راکھ سمجھ کر نہ اڑا
ہم نے جل جل کے ترے راستے چمکائے ہیں

علامہ عنایت اللہ خان مشرقی بیسویں صدی کی چند یگانۂ روزگار شخصیات میں سے ایک ہیں۔ ان کی شخصیت یک رخی نہیں بلکہ ہشت پہلو تھی۔ نامور ریاضی دان، ماہرِ تعلیم، مفسرِ قرآن، شاعر اور انقلابی سیاست دان۔ یہ ہیں ان کی فکری اورعملی زندگی کی جولاں گاہیں۔ ان میں سے ہر ایک میدانِ عمل میں انہوں نے اتنے ہنگامے اٹھائے کہ ہنگامہ خیزی بھی ان کی شخصیت کا ایک جلی عنوان بن کر رہ گئی۔

علامہ مشرقی کی سیاست سامراج دشمنی پر مبنی انقلابی سیاست تھی۔ انہوں نسے اپنے انقلابی پروگرام سے اسلامیانِ ہند میں ایک نئی اورحرکی روح پھونک دی تھی۔ یہ ان کی صداقتِ احساس اور دیانتِ کردار کا کرشمہ ہے کہ خاکسار تحریک منتشر ہوکر رہ جانے سے نصف صدی بعد بھی وہ خاکساروں کے دل میں بستے ہیں۔ ان کے فکر وعمل پر دادِ تحقیق دینے میں بتدریج ترقی دیکھنے میں آرہی ہے۔ انگریزی اور اردو میں اب تک اس موضوع پر متعدد قابل تحسین کتابیں شائع ہوچکی ہیں۔ ''خاکسار تحریک کی انقلابی جدوجہد'' اس سلسلے کی تازہ کڑی ہے۔

جناب ثناء اللہ اختر پرانے قلمکار، نامور ماہر ابلاغیات اور دردمند شخص ہیں۔ وہ ایک ایسے خاندان کے چشم و چراغ ہیں جس نے برصغیر میں خاکسار تحریک کے فروغ میں نمایاں کردار سرانجام دیا ہے۔ ان کے والد گرامی راجا شیرزمان علامہ مشرقی کے دست راست تھے۔ وہ تحریک کے اعلیٰ ترین رہنماؤں میں شمار ہوتے تھے۔ انہوں نے تحریر وتصنیف کے میدان میں بھی تحریک اور قائدِ تحریک کے مشن کو آگے بڑھانے میں یادگار کارنامے سرانجام دیئے ہیں۔ یوں سمجھئے کہ جناب ثناء اللہ اختر کی ابتدائی تربیت تحریک خاکسار کے گہوارے میں سرانجام پائی۔ انہوں نے انتہائی ہمدردی مگر ازحد تحقیقی احتیاط کے ساتھ یہ کتاب لکھی ہے۔ کتاب کا آغاز ''تذکرہ'' سے ہوتا ہے اور خود علامہ مشرقی کے ہاتھوں تحریک کے اختتام کے

اعلان پر بیانیہ تکمیل کو پہنچتا ہے۔

جناب ثناء اللہ اختر کا یہ تحقیقی کارنامہ ہماری آزادی کی تحریکوں میں خاکسار تحریک کے فیصان اور قائد تحریک کے کمالات کو اجاگر کرنے کی کامیاب کوشش ہے۔ اس کتاب کا مطالعہ ہمیں صرف خاکسار تحریک کے ہی کم و بیش سے متعارف نہیں کراتا بلکہ اس سے آگے، بہت آگے بڑھ کر تمام ہم عصر تحریکوں کی خوبیوں اور خامیوں کو سمجھنے کا موقع فراہم کرتا ہے۔ مغرب کی ذہنی غلامی اور کھوکھلی نقالی پر نازاں حکمران طبقہ ہماری حقیقی آزادی کی راہ میں کیونکر حائل ہے؟ کب تک حائل رہے گا؟ معاشی استحصال پر پروان چڑھنے والے طبقات کب تک غریب عوام کو اپنا صیدِ زبوں بنائے رکھیں گے؟ عوام کو اپنی طاقت کا احساس کس طرح دلایا جا سکتا ہے؟ پھر اس منتشر طاقت کو ایک ناقابلِ تسخیر قوت میں کیسے ڈھالا جا سکتا ہے؟۔۔۔ اس طرح کے تمام سوالات کے جوابات خاکسار تحریک کے سیاسی لٹریچر اور خاکسار تحریک کی حیرت انگیز تنظیم میں موجود ہیں۔ ثناء اللہ اختر نے یہ کتاب لکھ کر ہمیں اس طرح کے سوالات پر ازسرنو غور کرنے کی دعوت دی ہے۔ اس اعتبار سے دیکھیں تو یہ کتاب ہمارے ماضی کا ایک زریں باب بھی ہے، ہمارے آج کے سوالوں کا جواب بھی ہے اور ہمارے مستقبل کی صورت گری میں کام دینے والے چند اصول و اقدار کا مخزن بھی۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

رفیع اللہ۔ایم۔اے

فِقہی اِصطلاحات

آپ صبح سے شام تک اس قسم کے الفاظ سنتے ہوں گے کہ۔۔ یہ فرض ہے' یہ واجب' یہ سنت ہے' یہ مستحب یا یہ حرام ہے' یہ مکروہ۔۔ کیا آپ نے کبھی اس پر غور کیا ہے کہ ان الفاظ کا مفہوم کیا ہے۔ اور ان میں فرق کیا؟ ہم نے یہ سوال اٹھایا اس لئے ہے کہ جب کسی بات کے متعلق یہ سن لیا جائے کہ (مثلاً) یہ فرض ہے یا واجب۔ یا ایسا کرنا سنت ہے' تو اس سے اس بات کے متعلق ایک خاص تصور ذہن میں پیدا ہو جاتا ہے' اور ایسا نہ کرنے سے انسان یوں محسوس کرنے لگ جاتا ہے کہ اگر وہ دائرہ اسلام سے خارج نہیں ہو گیا۔ تو بھی (کم از کم) اس سے کوئی سنگین جرم سرزد ہو گیا ہے۔ جس سے اس کی روح پر کپکپی طاری ہو جاتی ہے۔

اس کی وضاحت کے لئے ہم قربانی کے مسئلہ کی مثال پیش کرتے ہیں۔ اس بارے میں عامتہ الناس کو یہ باور کرایا جاتا ہے کہ قربانی کے واجب ہونے پر اجماع امت ہے۔ یعنی امت مسلمہ کے تمام اہل علم یا کم از کم ان کی اکثریت کے نزدیک یہ ہر صاحب نصاب مسلمان پر واجب ہے کیونکہ سنت ہے اور سنت بھی موکدہ۔ اب ''سنت مؤکدہ'' کے الفاظ سن کر اس کی اہمیت بڑی نمایاں ہو جاتی ہے۔ لیکن دیکھئے کہ ان تمام ائمہ کے نزدیک جن میں امام مالکؒ امام شافعیؒ اور امام احمدؒ حنبل شامل ہیں' قربانی کا شرعی حکم کیا ہے۔ (الفقہ علی المذاہب الاربعۃ۔ جلد ا صفحہ ۵۹۳)۔

فالاضحیۃ سنۃ عین موکدۃ یاب فاعلھا ولا یعاقب تارکھا۔

قربانی سنت عین مؤکدہ ہے' کرنے والا ثواب کا حقدار ہو گا اور نہ کرنے والے پر کوئی شرعی گرفت نہیں۔

یعنی اگر کوئی مسلمان ثواب حاصل کرنا چاہتا ہے تو وہ اس پر عمل کرے کیونکہ یہ سنت ہے لیکن کسی کو اس پر مجبور نہیں کیا جا سکتا اور نہ ہی ایسا کرنے والے پر شریعت کی طرف سے کوئی مواخذہ ہو گا۔ اگر لوگوں کو ان فقہی اصطلاحات کا صحیح علم ہو' تو وہ ہر عمل کا صحیح مقام متعین کر سکتے

ہیں۔اس لئے ہم مناسب سمجھتے ہیں کہ ائمہ اربعہ نے جو فقہی اصطلاحات متعین کی ہیں' ان کا ترجمہ عوام تک پہنچا دیا جائے۔ یہ اصطلاحات فقہ کی مشہور کتاب 'الفقہ علی المذاہب الاربعہ جلد اول' کے آخر میں بڑی مناسب ترتیب سے دی گئی ہیں۔ہم وہاں سے ان کا ترجمہ کرتے ہیں۔

اس مقام پر یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ یہ اصطلاحات قرآن کی نہیں' فقہ کی ہیں۔قرآن میں تو اوامر اور نواہی ہیں۔یعنی کسی کام کے کرنے کا حکم یا اس سے باز رہنے کی تاکید۔ اوامر کے سلسلہ میں فرض' واجب سنت' مستحب وغیرہ کی تفریق اور ان کے لئے یہ اصطلاحات' ائمہ فقہ کی متعین کردہ ہیں۔اب ان اصطلاحات کا ترجمہ دیکھئے:

شافعی فقہ کی اصطلاحات

فرض اور واجب: شافعی مذہب میں واجب اور فرض کی اصطلاحات ایک ہی مفہوم رکھتی ہیں اور ان کا شرعی حکم یہ ہے کہ ان پر عمل کرنے والا ثواب کا مستحق ہوتا ہے اور جو انہیں ترک کر دے اس پر شرعی سزا لازم ہوگی۔ مثلاً فرض نماز کو پورا کرنے والا ثواب کا حقدار ہوگا اور اسے ترک کرنے والے کو جہنم کا عذاب دیا جائے گا۔اسی طرح تمام دوسرے فرائض میں بھی۔ ہاں بعض اوقات فرض اور واجب کی اصطلاحات میں فرق کیا جاتا ہے اور وہ عام طور پر حج کے احکام ہیں۔ وہاں فرض سے وہ احکام مراد لئے جاتے ہیں جن کی عدم تعمیل کی وجہ سے حج باطل ہو جائے اور واجب وہ احکام ہیں کہ اگر رہ بھی جائیں تو فدیہ دینے سے ان کی تلافی ہو جاتی ہے۔

حرام: حرام وہ ہے جس کے ارتکاب پر مرتکب کو سزا دی جائے اور اس سے بچنے پر وہ مستحق ثواب ہوگا۔اور جب کوئی ایسا شخص جس کے لئے حرام سے ہر حالت میں بچنا لازمی ہے' اس میں پڑ جائے گا تو اسے جہنم کا عذاب ہوگا۔

مکروہ: مکروہ وہ ہے جس کا ترک کرنا فرض تو نہ ہو لیکن مستحسن ضرور ہو۔اس لئے جب کوئی مسلمان اس کا ارتکاب کر لے گا تو اسے عذاب تو کوئی نہیں ہوگا' ہاں جب اسے ترک کرے گا' تو ضرور ثواب کا مستحق ہوگا۔

سنت' مندوب' مستحب' تطوع۔۔ یہ تمام اصطلاحات شافعیہ کے نزدیک مترادف مفہوم رکھتی ہیں۔ یعنی ان پر عمل کرنا تو مستحسن ہے لیکن لازمی اور فرض نہیں۔ اس لئے ان پر عمل کرنے والا ثواب کا حقدار ہوگا۔لیکن اگر کوئی ان کو ترک کر دے گا تو ان پر شریعت کی طرف سے کوئی پکڑ نہ ہوگی۔

شافعیہ کے نزدیک سنت کی دو قسمیں ہیں۔ایک سنت عین' جس پر ہر مومن انفرادی طور پر عمل کرے جیسا کہ فرائض' مثلاً نماز' روزہ انفرادی طور پر لازم ہوتے ہیں۔۔ سنت کی دوسری قسم سنت کفایہ ہے۔اور وہ یہ ہے کہ جب جماعت میں سے کوئی ایک بھی اس پر عمل کر لے تو بقیہ سے وہ ساقط ہو جائے۔جیسا کہ جماعت میں سے ایک آدمی سلام

کی ابتداء کرے' یا جب بہت سے کھانے والے ہوں تو ان میں سے ایک کھانے پر بسم اللہ پڑھ لے' یا بہت سے لوگوں کی موجودگی میں ایک آدمی کا چھینک کا جواب دینا۔ پس ان تمام امور میں جب جماعت میں سے ایک آدمی کر لے گا تو تمام جماعت سے سنت کا مطالبہ دور ہو جائے گا۔ لیکن ان میں سے ثواب کے لئے صرف وہی ایک مخصوص ہوگا۔ اسی طرح واجب کی بھی دو قسمیں ہیں۔۔ واجب عین' جو ہر شخص پر انفرادی طور پر لازم ہو جیسا کہ بیان ہو چکا ہے اور دوسرا واجب کفایہ۔ اور وہ یہ ہے کہ جب جماعت میں سے کوئی ایک بھی اس پر عمل کرے' تو باقیوں سے ساقط ہو جائے۔ جیسا کہ نماز جنازہ میں شرکت اور سلام کا جواب دینا وغیرہ۔

مالکی فقہ کی اصطلاحات

واجب: مالکیہ کے نزدیک واجب وہ ہے جس پر عمل کرنے سے ثواب ہو اور اسکے ترک کرنے پر سزا و عذاب ہو۔ اسے فرض اور لازم بھی کہا جاتا ہے۔ جیسا کہ فرض نمازیں۔ ہاں حج کے احکام میں فرض اور واجب میں کچھ فرق کیا جاتا ہے۔ فرض وہ شرعی حکم ہے جس کے ترک کرنے سے سرے سے حج ہی باطل ہو جائے اور واجب وہ ہے جس کی کمی فدیہ دے کر پوری کی جا سکے۔

مالکیہ کے نزدیک بھی فرض کی دو قسمیں ہیں۔ فرض عین وہ ہے جس کا ہر مکلّف مسلمان سے مطالبہ کیا جائے اور فرض کفایہ وہ ہے کہ جب کوئی ایک شخص بھی اس پر عمل کرے تو بقیہ لوگوں سے ساقط ہو جائے۔ جیسا کہ نماز جنازہ اور میت کا کفن دفن وغیرہ۔

حرام: حرام یہ ہے کہ جس کے ارتکاب پر سزا ہو اور اس کا ترک کرنا مستحسن ہو۔ اس کے لئے دوسرے اصطلاحی نام' محظور' معصیت وغیرہ ہیں۔ اس کی مثال شراب نوشی وغیرہ ہیں۔

سنت: سنت وہ ہے جس کی حضورﷺ نے فرمائش کی ہو اور پھر اس کی تاکید کی ہو اور اس کی بڑی قدر بیان کی ہو اور اسے پوری جماعت کے سامنے کیا ہو اور کوئی دلیل اس کے واجب ہونے پر دلالت نہ کرے۔ جب کوئی مسلمان اس پر عمل کرے گا تو وہ ثواب کا مستحق ہوگا اور جب اسے ترک کرے گا تو اسے کوئی پکڑ نہ ہوگی اور اس کی مثال وتر اور عیدین کی نماز ہے۔

مندوب: جسے حضورؐ نے کرنے کو تو کہا ہو لیکن زیادہ زور نہ دیا ہو اور معاملہ کو ہلکا سمجھا ہو۔ پس جب کوئی مسلمان اس پر عمل کرے گا تو اسے ثواب ملے گا اور جب کوئی ترک کرے گا تو اس سے شریعت میں کوئی مواخذہ نہ ہوگا۔ جیسا کہ نماز ظہر کے پہلے کی چار رکعتیں وغیرہ۔

مکروہ: مکروہ وہ چیز ہے جس سے شارع علیہ السلام نے منع تو کیا ہو لیکن زیادہ زور نہ دیا ہو۔ پس جب کوئی اس میں پڑ جائے گا تو اسے شریعت کی طرف سے کوئی سزا تو نہ ہوگی۔ ہاں اسے خلاف اولیٰ کہیں گے۔ جیسے تبلیغ کے کام کو ترک کر

دینا یا نماز عصر کے بعد نفل وغیرہ پڑھنا۔

مباح: یہ ہے کہ جس کا شارع علیہ السلام نے نہ تو کرنے کا مطالبہ کیا ہو اور نہ ہی اس سے منع کیا ہو پس ایک مکلّف مسلمان اس کے کرنے اور ترک کرنے میں مختار ہے۔

حنبلی فقہ کی اصطلاحات

فرض: ان کے نزدیک بھی فرض کی وہی تعریف ہے جو اوپر گذر چکی ہے۔۔حنابلہ فرض کو رکن بھی کہتے ہیں۔

واجب: یہ بھی فرض کی طرح ہے۔مگر حج میں فرض وہ ہے جس کے رہ جانے سے حج باطل ہو جائے اور واجب وہ ہے جس کے رہ جانے پر فدیہ دے کر اس کی تلافی کر لی جائے۔ اسی طرح نماز کے بعض اعمال میں واجب اور فرض میں کچھ فرق کیا جاتا ہے۔حنابلہ نے نماز کے کچھ واجبات گنائے ہیں۔جن کے عمداً ترک کرنے سے نماز باطل ہو جاتی ہے لیکن اگر بھول چوک سے کوئی کمی رہ جائے تو اسے سجدہ سہو کے ذریعہ پورا کر لیا جاتا ہے۔فرض میں یہ کمی سجدہ سہو سے پوری نہیں ہوسکتی بلکہ نماز ہی باطل ہو جاتی ہے۔دوسرے ائمہ کی طرح ان کے نزدیک بھی فرض کی دو ہی قسمیں ہیں۔ فرض عین اور فرض کفایہ۔سنت' مندوب اور مستحب ان کے نزدیک مترادف اصطلاحیں ہیں۔ان تمام کا ایک ہی مفہوم ہے۔ان پر عمل کرنے سے ثواب ملے گا اور ترک کرنے پر کوئی گرفت نہیں ہوگی۔

حرام: وہ ہے جس کے ترک کرنے پر ثواب ہو اور اس کے ارتکاب پر سزا اور عقاب ہو۔

حلال: یہ حرام کی ضد ہے اور اس میں واجب' مندوب اور مکروہ سب شامل ہیں۔پس واجب حلال کے ترک پر گنہگار بھی ہوگا اور سزا بھی ہوگی جبکہ دوسری حلال چیزوں کے کرنے یا ترک کرنے پر گنہگار نہ ہوگا۔

باطل: وہ ہے جس سے ذمہ پورا نہ ہو سکے۔مثلاً جب نماز کے ارکان میں سے کوئی رکن کم ہو گیا تو نماز باطل ہو جائے گی اور وہ اس شخص کے ذمہ رہے گی یہاں تک کہ وہ اسے دوبارہ ادا نہ کر لے۔

صحیح: وہ ہے جس سے ذمہ داری پوری ہو۔

حنفی فقہ کی اصطلاحات

فرض: حنفیہ کے نزدیک فرض وہ ہے جو دلیل قطعی سے ثابت ہو اور اس میں کوئی شبہ نہ ہو جیسے کہ پانچ نمازیں اور زکوٰۃ اور روزہ اور حج اور اللہ تعالیٰ پر ایمان۔فرض کا شرعی یہ حکم ہے کہ وہ اعتقادی اور عملی دونوں طرح سے لازم ہو۔پس جب کوئی اس کا انکار کر دے وہ کافر ہوگا اور جب اسے ترک کرے گا یعنی صرف عمل نہ کرے گا تو وہ شخص فاسق شمار ہوگا۔

واجب: حنفیہ کے نزدیک یہ فرض سے کمتر درجہ میں ہے اور جو ایسی دلیل سے ثابت ہو جس میں شبہ ہو اس کا شرعی حکم یہ ہے کہ یہ عملاً تو لازمی ہو اور اعتقاداً نہ ہو۔اس کا منکر شبہ کی گنجائش کی وجہ سے کافر نہ ہوگا اور اس کا تارک فرض سے کمتر

درجہ کا گنہگار ہوگا۔ کیونکہ جو فرائض کا تارک ہوگا اسے تو آگ کا عذاب دیا جائے گا لیکن جو واجب ترک کرے گا تو تحقیق یہ ہے کہ اسے آگ کا عذاب تو نہ ہوگا وہ صرف حضورﷺ کی شفاعت سے محروم ہوگا۔

سنت: احناف کے نزدیک سنت کی دو قسمیں ہیں۔ ایک سنت مؤکدہ' اور یہ بالکل واجب کے معنی میں ہے۔ پس اس کا ترک کرنے والا فرض سے کم درجہ کا گنہگار ہوگا اور جب یہ نماز میں سہواً رہ جائے تو سجدہ سہو سے اس کی تلافی ہو جائے گی' جیسا کہ واجب میں اور بعض واجب احکام' دوسرے واجب احکام سے زیادہ مؤکدہ ہے۔ مثلاً سجدۂ تلاوت صدقۂ فطر سے زیادہ واجب ہے اور ان دونوں کا وجوب ''قربانی'' سے زیادہ مؤکدہ ہے۔ دوسری قسم سنت غیر مؤکدہ ہے اور یہ مندوب اور مستحب ہے۔

حرام: حرام فرض کے مقابل ہے۔ اس کے مرتکب کو آگ کا عذاب ہوگا۔ اور بچنے والا مستحق ثواب ہوتا ہے۔

مکروہ تحریمی: مکروہ تحریمی یہ ہے جو حرام سے زیادہ قریب ہو اور وہ واجب اور سنت مؤکدہ کے مقابل ہو۔

مکروہ تنزیہی: مکروہ تنزیہی یہ ہے کہ جس کے ارتکاب پر کوئی شرعی مواخذہ نہ ہو اور اس پر عمل کرنے سے تھوڑا سا ثواب ہے اور یہ سنت غیر مؤکدہ کے مقابل ہے۔

(الفقہ علے المذاھب الاربعۃ۔ جلد اول' صفحہ ۶۱۵)۔

☆☆☆☆☆☆

طلوع اسلام:-

فقہ کی یہ اصطلاحات درحقیقت کسی زمانے کی اسلامی حکومت کے احکام و قوانین کی مختلف حیثیتوں کی نمائندہ تھیں۔ مثلاً آج بھی آپ دیکھئے۔ حکومت کی طرف سے نافذ کردہ احکام و قوانین کی مختلف نوعیتیں ہوتی ہیں۔ ''بائیں طرف چلو'' بھی قانون ہے۔ اور ''حکومت کے خلاف بغاوت نہ کرو'' بھی قانون ہے۔ اسی طرح ''انکم ٹیکس ادا کرو'' بھی ایک حکم ہے اور ''وارفنڈ میں چندہ دو'' بھی ایک طرح کا حکم۔ ان کی نوعیتوں کا فرق بھی ظاہر ہے۔ کسی زمانے کی اسلامی حکومت میں احکام و قوانین کی نوعیت کے فرق کے لئے اس قسم کی فقہی اصطلاحات وجود میں آئی تھیں۔ اب وہ حکومتیں تو باقی نہیں رہیں لیکن یہ اصطلاحات بدستور چلی آ رہی ہیں۔ اب ان کا نفاذ مولوی صاحبان کے فتوے کی شکل میں ہوتا ہے جس کی عملی حیثیت کا ہر ایک کو علم ہے۔ وہ اپنے حکم یا فتویٰ کی خلاف ورزی کرنے والوں کو بس اتنا ہی کہہ سکتے ہیں کہ کل قیامت کو دیکھنا' تمہارے ساتھ کیا ہوتا ہے۔ لیکن جب یہی اصطلاحات' حکومت کے قوانین کی حیثیت سے نافذ تھیں۔ ان کی خلاف ورزی کرنے والوں کے مواخذہ کو قیامت پر ملتوی نہیں کیا جاتا تھا عدالت فوراً فیصلہ کر دیتی تھی۔

اب بھی جب اور جہاں اسلامی حکومت قائم ہوگی اس کے قوانین کی مختلف حیثیتیں ہوں گی اور ان کی تعبیر کے لئے لامحالہ قانونی اصطلاحات بھی ہوں گی۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نقطۂ نظر

خواجہ ازہر عباس، فاضل درسِ نظامی

''محدث'' کی خدمتِ عالیہ میں

کمترین راقم سطور کا مضمون جو 'طلوع اسلام' کی اشاعت نومبر 2005ء میں طبع ہوا تھا اس میں اس کمترین نے پروفیسر محمد دین قاسمی صاحب کے نام نامی و اسم گرامی کے ساتھ پروفیسر کے علاوہ بریکٹ میں مولوی کا لقب بھی قدرے ازراہِ تفنن اور قدرے برائے عزت و توقیر تحریر کر دیا تھا۔ اس کے جواب میں جناب پروفیسر صاحب موصوف نے اپنے پورے مضمون میں میرے نام کے ساتھ مولوی کا لقب تحریر کیا ہے۔ مجھے اس بات سے تعجب اور خوشی ہوئی کہ حضرت کی Sense of Humour بہت اچھی ہے اور مولویوں کی سی یبوست طاری نہیں ہے۔ انہوں نے پورا Desired Effect دیا ہے اور پورے مضمون میں مجھے اچھی طرح رگیدا اور میری پوری خبر لی۔ میرا خدا گواہ ہے مجھے اس لقب سے کوئی عار نہیں۔ لیکن چونکہ میری ابتدائی زندگی کالجوں اور یونیورسٹیوں میں گذری اور زندگی کا بیشتر حصہ سول سروس میں گذرا' اس لئے میں مجبوراً علماء کی معاشرت اور لباس اختیار نہیں کر سکا اور اسی وجہ سے علماء کے زمرہ میں شامل ہونے کا شرف بھی حاصل نہیں کر سکا۔ اس لئے مولوی کا لقب نام کا جزو نہیں بن سکا۔ اب حضرت نے جو کرم فرمائی میرے ساتھ کی ہے اس کے لئے ان کا ممنون ہوں۔

مضمون مطالعہ کرنے کے بعد سب سے پہلا تاثر یہ ہوتا ہے کہ محترم پروفیسر صاحب کے دل میں پرویز صاحب کے خلاف ایک گہری خلش ہے جس کا اظہار بار بار ان کے مضمون میں ہو رہا ہے۔ کمترین راقم سطور نے اپنے مضامین میں پرویز صاحب کا ذکر نہیں کیا۔ قرآن کریم شخصیت پرستی کے سخت خلاف ہے۔ طلوع اسلام کا لٹریچر تو خصوصاً قرآن کریم کے اس پہلو کو خوب خوب نمایاں کرتا ہے۔ رسالہ 'طلوع اسلام' میں 'شخصیت پرستی' نام کا جامع مضمون بھی کئی بار طبع ہوا تھا' جس میں شخصیت پرستی کی سخت مخالفت کی گئی تھی۔ پرویز صاحب خود بھی بار بار اپنے متعلق یہ بات واضح کرتے رہے کہ ان کا کوئی قول حرفِ آخر نہیں ہے۔ راقم سطور نے اس معاملہ میں مزید احتیاط سے کام لیا

کہ جب بھی کسی نظریہ کی وضاحت کرنی ہوتی تو اس کو ہمیشہ طلوع اسلام کی طرف منسوب کرتا رہا کہ اس بارے میں طلوع اسلام کا یہ نظریہ ہے اور خود پرویز صاحب کے نام کو تحریر کرنے کو Avoid کرتا رہا۔ ہمیشہ یہی تحریر کیا کہ اس بارے میں طلوع اسلام کا یہ نظریہ ہے۔ اس لئے پروفیسر صاحب موصوف کو جو کچھ تحریر کرنا تھا بہتر یہی تھا کہ وہ اسی راقمِ سطور کو اپنا ہدف بناتے' پرویز صاحب کو درمیان میں لانا ضروری نہیں تھا کیونکہ طلوع اسلام جو قرآنی مزاج بناتا ہے اس میں شخصیت پرستی کی رمق بھی باقی نہیں رہتی۔

دوسرا تاثر وہی اصل موضوع یعنی وحی خفی کو ثابت کرنے سے گریز اور فرار کی راہ اختیار کرنا۔

میں نے اپنے متعلق تحریر کیا تھا کہ میں طبعًا مناظر نہیں ہوں اور میری روح مناظرہ سے اِبا کرتی ہے۔ منظور و مقصود صرف احقاقِ حق و ابطالِ باطل یعنی حدیث شریف کے بارے میں قرآن کریم کا موقف واضح کرنا ہے۔ حضرتِ اقدس نے بھی جواباً یہی تحریر فرمایا کہ وہ بھی مناظر نہیں ہیں ''اور صرف دینی ذوق کی بنا'' پر کھلے دل سے ہر مکتب فکر کا مطالعہ فرماتے ہیں''۔ مگر جناب کے مضمون سے یہ تیسرا تاثر ملتا ہے کہ جناب اس غلط فہمی میں میری طرح سے مبتلاء ہیں اور جناب کی طبع مناظرہ سے خوب میل کھاتی ہے اور جناب کو دوسرے شخص کو Corner کرنے میں خوشی و لذت محسوس ہوتی ہے۔ جب ہی تو جناب نے میری گذارشات و معروضات کو' جو بہت صدق دلی' اخلاص و محبت سے تحریر کی گئی تھیں' مناظرانہ انداز میں دس نکتوں میں تقسیم فرمایا۔ پھر ان دس نکات کا خوب خوب آپریشن فرمایا لیکن اصل موضوع کی طرف دوسرے حضرات کے مضامین کے حوالہ جات دینے کے باوجود خود ایک لفظ بھی اس بارے میں تحریر نہیں فرمایا۔ لیکن حضرت نے اپنے اس رویہ سے اس ہیچ مدان کو یہ موقع فراہم فرما دیا کہ یہ بھی نکات قائم کر کے' براہ راست جناب سے جواب کا مستدعی ہو اور اس طرح گریز و فرار کی راہ مسدود کر کے' جناب کو اس موضوع پر کچھ رقم کرنے پر مجبور کر دے۔ جناب نے دس نکات قائم فرمائے تھے۔ گو میں اس سے زیادہ نکات (Issues) قائم کر سکتا تھا لیکن چونکہ میں از راہ انکسار و فروتنی اس بات کا احساس قائم رکھنا چاہتا ہوں کہ میں حضرت سے ہر بات میں کمتر و فروتر ہوں اس لئے میں نے صرف 9 نکات قائم کئے ہیں۔ البتہ میری Privilege صرف اتنی ہے کہ میرا موقف قرآن کریم کے مطابق ہے۔ اب حضرت کا فرض ہے کہ احقاق حق کی خاطر ان نکات کا جواب تحریر فرما دیں تا کہ وحی خفی کے متعلق مختلف دعاوی و نظریات کی وضاحت ہو جائے۔

یہاں تک تو لگا لائے ہیں ہم منزل پہ ناصح کو
کہ سمجھاتا ہوا' اب تا درِ میخانہ آتا ہے

مزید یہ کہ جناب سے یہ بھی مودبانہ درخواست ہے کہ اس

کمترین کی اس جرأت و جسارت کو معاف فرماتے جائیں اور اب مضمون میں گریز کی راہ اختیار نہ فرمائیں۔ اب متعلقہ نکات پیش خدمت کئے جاتے ہیں۔

(1) وحی صرف جلی ہے۔

وحی کی ایک قسم کو خفی ماننا اور اس کو قرآن کے باہر تسلیم کرنا قطعاً غلط ہے۔ کیونکہ وحی صرف جلی ہے جبکہ حضورﷺ کو حکم تھا کہ وحی کو انسانیت تک ضرور بالضرور پہنچا دیں اور اس کو مخفی نہ رکھیں۔ وحی کا نزول اگر چلتی تلواروں میں بھی ہوتا تھا تو حضورﷺ کا فرض تھا کہ اس کو اسی وقت پہنچا دیں۔ چنانچہ حضورﷺ کو حکم الٰہی تھا۔

یاایھا الرسول بلغ ما انزل الیک من ربک وان لم تفعل فما بلغت رسالته (5/67)۔

اے رسول جو حکم تمہارے پروردگار کی طرف سے تم پر نازل کیا گیا ہے۔ پہنچا دو اور اگر تم نے ایسا نہیں کیا تو تم نے اس کا کوئی پیغام نہیں پہنچایا۔

وحی الٰہی کی تبلیغ حضورﷺ پر ایسی فرض تھی کہ کسی حال میں بھی اسے روکا نہیں جا سکتا تھا۔ لیکن حدیثوں کی یہ پوزیشن نہیں تھی۔ حدیثیں صرف حیا یا دل جوئی کے خیال سے روکی جا سکتی تھیں۔ حضورﷺ کے گھر میں غریب لوگ کھانا کھانے آتے تھے۔ وہ کھانا تیار ہونے سے کافی عرصہ پہلے ہی آ جاتے تھے اور کھانا ختم کرنے کے بعد بھی حضورﷺ کے گھر میں بیٹھے رہتے تھے۔ جو اگرچہ حضورﷺ کو گراں گزرتا تھا۔ اگر آپ انہیں اپنے حدیثی بیان سے منع فرما دیتے تو کوئی حرج نہیں تھا لیکن آپ شرم و حیا کی وجہ سے ایسی سچی حدیث بھی بیان نہیں فرماتے تھے لیکن جب یہی بات قرآن کریم میں نازل ہوگئی' تو اس وقت اس بات کے بیان میں حیا آپ کو مانع نہ ہو سکی اور اس کا فوری طور پر پہنچا دینا حضورﷺ پر فرض ہو گیا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ وحی کو تو حضورﷺ کسی حال میں بھی خفیہ رکھ ہی نہیں سکتے تھے۔ کیونکہ وحی رسول کی ملکیت نہیں ہوتی' یہ ساری انسانیت کے لئے ہوتی ہے۔ وحی خفی کا تصور ہی باطل اور غلط ہے۔

(2) وحی صرف متلو ہے۔

ہمارے علماء کرام وحی کو دو قسموں میں منقسم کرتے ہیں۔ ایک وحی متلو جو قرآن کریم میں محفوظ ہے جس کی تلاوت ہوتی ہے۔ دوسری وحی غیر متلو جو قرآن کے باہر ہے جس کی تلاوت نہیں کی جا سکتی۔ مگر قرآن کریم کا ارشاد ہے کہ وحی ساری کی ساری متلو ہوتی ہے لہٰذا قرآن کے اندر محفوظ ہے۔

کذلک ارسلناك فی امة قد خلت من قبلها امم لتتلوا علیهم الذی اوحینا الیک وهم یکفرون بالرحمن (13/30)۔

اے رسول اسی طرح ہم نے تم کو اس امت میں

بھیجا ہے جس سے پہلے اور بہت سی امتیں گذار چکی ہیں تا کہ تم ان کے سامنے اس کی تلاوت کرو جو ہم نے تمہیں وحی کیا ہے۔

اس آیت کریمہ سے واضح اور ثابت ہے کہ مطلق مایوحیٰ متلو ہے جس کی تلاوت حضورﷺ فرمایا کرتے تھے اور وحی ساری متلو ہے جو قرآن میں محفوظ ہے۔ غیر متلو کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ وحی غیر متلو ہو ہی نہیں سکتی۔

(3) وحی کی مثل نہیں بن سکتی۔

وحی کی ایک بنیادی خصوصیت جو متفقہ طور پر تسلیم کی جاتی ہے یہ ہے کہ اس کی مثل نہیں بن سکتی۔ کیونکہ اس بارے میں قرآن کریم کی واضح نص موجود ہے کہ وحی کی مثل نہیں لائی جاسکتی۔ ارشاد ہوتا ہے۔

وان کنتم فی ریب مما نزلنا علیٰ عبدنا فاتوا بسورۃ من مثلہٖ (2/23)۔

اور اگر تم شک میں ہو اس چیز سے جو ہم نے اپنے بندے کے اوپر اتاری ہے، پس لے آؤ ایک سورۃ اس کے مانند۔

اس آیت کریمہ میں قرآن کریم نے ایک واضح معیار مقرر فرما دیا ہے کہ وحی کی مثل نہیں بن سکتی۔ باقی ہر چیز کی مثل بن سکتی ہے۔ اس آیۂ کریمہ میں توجہ طلب اور قابل غور نکتہ یہ ہے کہ آیت میں معارضہ صرف قرآن کریم کا نہیں کیا گیا ہے کہ کفار قرآن کا مثل نہیں لا سکتے بلکہ آیت ہذا میں معارضہ مما نزلنا کا کیا گیا ہے چونکہ یہاں ما تعمیم کا ہے جس کے معنی ہیں کہ معارضہ ہر اس چیز کا کیا گیا ہے جو کچھ بھی نازل کی گئی ہے۔ اس نکتہ کو پیش نظر رکھ کر غور کرنے کے بعد ہر شخص بآسانی اس نتیجہ پر پہنچ سکتا ہے کہ وحی صرف قرآن میں ہے جس کا مثل و نظیر نہیں ہے۔ قرآن کے علاوہ کوئی چیز بے مثل نہیں ہے۔ حتیٰ کہ روایات بھی بے مثل نہیں ہیں اور ہر قسم کی روایات کتب احادیث میں چلی آ رہی ہیں اور واضعین نے ان کی مثل بنا کر کتب میں داخل کر دیا ہے۔

(4) وحی قطعی ہوتی ہے ظنی نہیں ہوسکتی۔

ایمان و عمل کی ساری عمارت یقین پر مبنی ہوتی ہے۔ اگر کسی معاملہ میں ذرا سا بھی شک و تردد واقع ہو جائے تو اس پر دل جمعی کے ساتھ ایمان و یقین نہیں لایا جا سکتا اور انسان اضطراب و کشمکش میں مبتلا رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان سے ایمان لانے کا مطالبہ کیا تو وحی کو محفوظ اور منضبط شکل میں رکھنے کا بھی وعدہ اور اہتمام فرمایا تا کہ ہر شخص یقینی طور پر ایمان لا سکے۔ قرآن کے علاوہ ہر چیز ظنی ہے اور ظن پر تو ایمان لایا ہی نہیں جا سکتا۔ اس پر کسی شخص کی بھی طبیعت مطمئن نہیں ہوسکتی۔ اسی وجہ سے ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

ان الظن لا یغنی من الحق شئیاً (53/28)۔

تحقیق گمان نہیں کفایت کرتا حق سے۔

نیز ارشاد ہوا۔

یاایھا الذین آمنوا اجتنبوا کثیراً من الظن ان بعض الظن اثم (49/12)۔

اے لوگو جو ایمان لائے ہو بچو بہت گمانوں سے' تحقیق بعض گمان گناہ ہوتے ہیں۔

ان واضح آیات کے باوجود جن میں مومنین کو ظن سے بچنے کی ہدایت ہے۔ کیا خود اللہ تعالیٰ انسانوں کو اس حالت پر مجبور کرتا کہ اس کے ایمان و یقین کی بنیاد واضح نہ ہو اور اس سے کسی غیر واضح اور غیر متعین چیز پر ایمان لانے کا مطالبہ کیا جاتا۔ ایسا ہرگز نہیں ہوسکتا۔ یقیناً وحی قطعی اور یقینی ہی ہوسکتی ہے اور وہ صرف قرآن کریم ہے۔ روایات اس مقام پر نہیں ہوسکتیں کیونکہ روایات کے مشہور جامعین بھی اس کے ظن ہونے پر متفق ہیں جبھی تو روایات کے آخر میں کما قال علیہ السلام تحریر کیا جاتا ہے۔

(5) وحی کے کسی حصہ کو بھی مسترد نہیں کیا جا سکتا۔

پوری اور مکمل وحی پر ایمان لانا ضروری ہوتا ہے چنانچہ ارشاد حضرت باری تعالیٰ ہے۔

افتومنون ببعض الکتاب و تکفرون ببعض (2/85)۔

کیا پس ایمان لاتے ہو ساتھ بعض کتاب کے اور کفر کرتے ہو بعض کے ساتھ۔

وحی کے بعض حصہ پر ایمان لانا اور بعض پر ایمان نہ لانے سے ایمان درست نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ اگر قرآن کریم کی کسی ایک آیت کا بھی انکار کر دیا جائے تو وہ کفر کے مرادف ہے اس کے برعکس روایات کی یہ پوزیشن نہیں ہے۔ ان سب پر ایمان لانا ضروری نہیں ہے۔ مختلف فرقوں کی روایات اور کتب روایات بھی بالکل مختلف ہیں۔ کوئی فرقہ کچھ روایات کو درست مانتا ہے اور بعض کچھ دوسری کو۔ جو حضرات خارج از قرآن وحی کے قائل ہیں وہ بھی ہر روایت پر ایمان لانا ضروری نہیں خیال کرتے۔

(6) حصر تعلیم۔

اللہ تعالیٰ کی تعلیم صرف قرآن کریم ہے۔ یعنی منجانب اللہ حضور ﷺ کی طرف کوئی اور تعلیم نہیں آئی۔ جیسا کہ ارشاد ہے۔

وما علمنہ الشعر وما ینبغی لہ ان ھو الا ذکر و قران مبین (36/69)۔

اور نہیں تعلیم دی ہم نے اس اپنے رسول کو کسی شعر کی کیونکہ شعر اس کے لائق نہیں ہے۔ اس لئے نہیں ہے وہ تعلیم ہماری سوائے ذکر یعنی قرآن مبین کے۔

اس آیۂ کریمہ میں ان ھو الا ذکر و قرآن مبین سے واضح ہے کہ من جانب اللہ حضورﷺ کو صرف قرآن تعلیم کیا گیا تھا۔ کیونکہ ان ھو الا ذکر و قرآن مبین میں الا کلمۂ استثنا ہے اور مستثنیٰ منہ مذکور نہیں ہے۔ اہل علم پر اور پروفیسر صاحب محترم پر یہ مخفی نہیں کہ جب مستثنیٰ منہ مذکور نہ ہو تو مستثنیٰ اس کے قائم مقام ہو جاتا ہے اور الا کلمۂ استثنا وہاں حصر کا فائدہ دینے لگتا ہے جس سے ثابت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضورﷺ کو بجز قرآن مبین کے اور کوئی تعلیم نہیں دی جب اللہ تعالیٰ نے اپنی تعلیم کا حصر فرما دیا تو اس حصر کے ہوتے ہوئے قرآن کے علاوہ وحی نازل ہونے کا خیال تک نہیں ہونا چاہئے۔

اس آیۂ کریمہ میں نفی و اثبات کے حصر کے ساتھ واضح طور پر بتایا گیا ہے کہ حضورﷺ کو جو بھی تعلیم اللہ تعالیٰ کی طرف سے ملی تھی وہ صرف اور صرف ذکر یعنی قرآن ہے اس کے علاوہ ہر قسم کی تعلیم کے متعلق نفی کی گئی ہے کہ جو بھی تعلیم دیا گیا ہے وہ صرف ذکر یعنی قرآن ہے۔ ذکر کی وضاحت خود قرآن نے سورۂ حٰم سجدہ میں یوں فرمائی کہ۔

ان الذین کفروا بالذکر لما جاء ھم و انہ لکتٰب عزیز لا یاتیہ الباطل من بین یدیہ ولا من خلفہ تنزیل من حکیم حمید (41/41)۔

جن لوگوں نے نصیحت کو جب وہ ان کے پاس آئی نہ مانا (وہ اپنا نتیجہ دیکھ لیں گے) اور یہ قرآن تو یقینی ایک عالی رتبہ کتاب ہے کہ جھوٹ نہ تو اس کے آگے ہی پھٹک سکتا ہے اور نہ اس کے پیچھے سے اور خوبیوں والے دانا (خدا) کی بارگاہ سے نازل ہوئی ہے۔

اس آیۂ کریمہ نے ذکر کی وضاحت کر دی کہ ذکر قرآن ہے اور قرآن کے علاوہ کوئی دوسری چیز نہیں ہے۔ البتہ ایک اشکال یہاں ذکر اور قرآن کے درمیان والی واؤ کا بھی پیدا کیا جاتا ہے کہ یہ واؤ عاطفہ ہے اس لئے قرآن اور ذکر مختلف دو چیزیں ہیں۔ لیکن درست بات یہ ہے کہ یہ واؤ عاطفہ نہیں ہے بلکہ یہ واؤ بیانیہ ہے جو قرآن کریم میں بکثرت واقع ہوئی ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے۔

ھو الذی ارسل رسولہ بالھدی و دین الحق۔

اللہ وہ ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت یعنی دین کے ساتھ بھیجا۔

اگر اس آیۂ کریمہ میں واؤ کو عاطفہ قرار دیا جائے جو مغائرت کی متقاضی ہے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ہدایت اور چیز ہے اور دین اور شے ہے اور دین میں ہدایت نہیں ہے جو بالبداہت غلط ہے۔ لہٰذا یہاں واؤ کو واؤ بیانیہ ہی تسلیم کرنا ہوگا۔ اسی طرح ذکر اور قرآن کے درمیان واؤ

بیانیہ تفسیر یہ ہے جس کے معنے ہیں کہ حضورﷺ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے تعلیم صرف ذکر یعنی قرآن کیا گیا ہے۔

(7) مایوحیٰ اور قرآن ایک ہی چیز ہے۔

واتل ما اوحی الیک من کتاب ربک لا مبدل لکلمٰته (18/27)۔

اور پڑھ جو کچھ وحی کی گئی ہے طرف تیری' کتاب پروردگار تیرے سے نہیں کوئی بدلنے والا اس کی باتوں کو()۔شاہ عبدالقادر۔

انما امرت ان اعبد رب هذه البلدة الذی حرمها وله کل شئی وامرت ان اکون من المسلمین وان اتلوا القرآن (27/92)۔

مجھے تو بس یہی حکم دیا گیا ہے کہ میں اس شہر کے مالک کی عبادت کروں جس نے اسے عزت حرمت دی ہے اور ہر چیز اسی کی ہے اور مجھے یہ حکم دیا گیا ہے کہ میں اس کے فرمانبرداروں میں سے ہوں اور یہ کہ میں قرآن پڑھا کروں۔

پہلی آیت میں ما اوحی کی تلاوت کا حکم ہے اور دوسری آیت میں قرآن کریم کی تلاوت کا حکم ہے جس سے ظاہر ہے کہ ما اوحی اور قرآن ایک چیز ہے اور دونوں الفاظ ایک دوسرے کے متبادل استعمال کئے گئے ہیں اور ما اوحی صرف قرآن ہے۔ نیز یہ کہ پہلی آیت میں من بیاتیه ہے۔کسی طرح بھی تبعیفیه نہیں ہو سکتا۔

(8) کتاب اور ما انزل ایک ہی چیز ہے۔

هذا کتاب انزلنٰه مبرك فاتبعوه واتقوا لعلکم ترحمون (6/155)۔

اور یہ کتاب جس کو ہم نے نازل کیا برکت والی کتاب ہے تو تم لوگ اس کی پیروی کرو اور خدا سے ڈرتے رہو تا کہ تم پر رحم کیا جائے۔

دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے۔

اتبعوا ما انزل الیکم من ربکم ولا تتبعوا من دونه اولیاء (7/3)۔

جو تمہارے پروردگار کی طرف سے تم پر نازل کیا گیا ہے' اس کی پیروی کرو اور اس کے سوا دوسرے سرپرستوں کی پیروی نہ کرو۔

پہلی آیۂ کریمہ میں کتاب کے اتباع کا حکم دیا گیا ہے اور دوسری آیت میں ما انزل الیکم کے اتباع کا حکم دیا گیا ہے۔ صرف الفاظ کو ایک دوسرے کی جگہ رکھا گیا ہے۔جس سے ثابت ہے کہ ما انزل صرف کتاب ہے۔

(9) منزل من اللہ صرف کتاب ہے۔

ارشاد ہوتا ہے۔

وانزلنا الیک الکتاب بالحق مصدقا لما بین یدیه من الکتب و

مھیمنا علیہ فاحکم بینھم بما انزل اللہ (5/48)۔

اور اے رسول ہم نے تم پر بھی کتاب برحق نازل کی جو کتاب پہلی کتابوں کی تصدیق کرتی ہے اور اس کی نگہبان ہے تو جو کچھ خدا نے تم پر نازل کیا ہے۔ اس کے مطابق تم بھی حکم دو۔

اس آیت کریمہ میں کتاب کی وضاحت خود بما انزل اللہ نے کر دی کہ کتاب سے مراد ماانزل ہے اور ماانزل اللہ سے مفہوم کتاب ہے دونوں ایک ہی چیز ہیں۔

چونکہ صدر مضمون میں وعدہ کیا گیا تھا کہ راقمِ سطور حضرت کی برابری نہیں کرنا چاہتا' اس لئے حضرت سے فروتر اور کمتر ہونے کی وجہ سے صرف ان 9 نکات پر اکتفاء کیا جاتا ہے اور عقلی دلائل جو ان میں شامل نہیں کئے گئے' ان میں سے چند پیش خدمت عالی کئے جاتے ہیں۔

قرآن کریم یقیناً یقیناً وحی الٰہی ہے۔ اگر احادیث بھی وحی الٰہی ہیں اور حضورﷺ کا قول نہیں ہیں' تو حضورﷺ کے ذاتی بشری اقوال کون سے باقی رہ جاتے ہیں۔ کیا حضورﷺ نے اپنی نبوت کے 23 سال کے دوران کبھی اپنی غور وفکر سے گفتگو نہیں فرمائی۔ قرآن کریم میں ارشاد ہوتا ہے۔

ادعوا الی اللہ علی بصیرۃ انا و من اتبعنی (12/108)۔

میں لوگوں کو خدا کی طرف بلاتا ہوں' میں اور میرا پیرو دلائل کے ساتھ۔

ظاہر ہے کہ حضورﷺ جو دلائل پیش فرماتے تھے وہ حضورﷺ کی غور وفکر کا نتیجہ ہوتے تھے' اس میں وحی خفی کو کوئی دخل نہیں ہوسکتا۔ اسی طرح حضورﷺ مختلف امور کے فیصلے فرماتے تھے۔ ان فیصلوں کے نتائج حضورﷺ کی اپنی فہم وفراست سے متسخرج ہوتے تھے۔ ان کو وحی خفی سے کیا علاقہ۔

قرآن کریم وحی الٰہی ہے۔ اس کی اطاعت سے اللہ تعالیٰ سبحانہٗ کی اطاعت ہوتی ہے۔ اگر حدیث شریف بھی وحی الٰہی ہے تو اس سے حضورﷺ کی اطاعت کیسے ہوسکتی ہے۔ حالانکہ عام نظریہ یہ ہے کہ حدیث شریف سے حضورﷺ کی اطاعت ہوتی ہے۔ ایک وحی سے اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور دوسری وحی سے رسول اللہ کی اطاعت' بھلا یہ تفریق کیسے ممکن ہوسکتی ہے۔

اصل یہ ہے کہ جنہیں ہم احادیث کہتے ہیں' یہ احادیث ہیں ہی نہیں یہ تو روایات میں اور رواۃ کے اپنے الفاظ میں۔ ہمارے علمائے کرام بمعہ پروفیسر موصوف احادیث کے بالمعنی منقول ہونے کے معترف ہیں۔ یہ الفاظ Narrated ہیں جب ہی تو روایات کے بعد اوکما قال علیہ السلام لکھا جاتا ہے۔ ہمارے علمائے کرام خود یہ مانتے ہیں کہ یہ حضورﷺ کے الفاظ نہیں ہیں

بلکہ رواۃ کے الفاظ ہیں۔ تعجب اور ہزار تعجب ہے کہ رواۃ کے یہ الفاظ وحی الٰہی کیسے ہو سکتے ہیں۔

یہ بات بھی غور کرنے کے قابل ہے کہ چند فقرے وضع کر کے، انہیں حضورﷺ کی طرف منسوب کر کے، ان کی اطاعت سے حضور کی اطاعت نہیں ہو جاتی۔ بلکہ ان کی اطاعت سے اس راوی کی اطاعت ہوتی ہے جس کے یہ الفاظ ہیں۔ جرح و تعدیل کے بعد محدثین کرام نے جن روایات کو موضوع قرار دیا ہے ان کی اطاعت سے ان رواۃ کی اطاعت ہوتی ہے۔ اس سے حضورﷺ کی اطاعت کو کوئی علاقہ نہیں ہے۔

حد درجہ کوشش کی گئی ہے کہ مضمون بہت مختصر Pirecise اور مرتکز بہ موضوع رہے، حشو و زوائد سے پاک رہے تا کہ جواب میں اصل موضوع ہی زیر بحث آ سکے اور فرار کی راہ مسدود رہے۔

وھٰھنا تم منا الکلام
علی مصطفنا الوف سلٰم

☆☆☆

محمد عربی کہ آبروئے ہر دوسرا است
کسے کہ خاکِ درش نیست خاک برسرِ او

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نذیر ناجی

ابھی وقت ہے

صدر پرویز مشرف کے طرز حکومت یا جمہوری نظام کے بارے میں کچھ بھی کہا جا سکتا ہے لیکن مذہبی انتہا پسندی، دہشت گردی اور فرقہ واریت سے پاک نظام تعلیم کے بارے میں ان کے خیالات سے اختلاف اس لئے نقصان دہ ہے کہ اگر ہم دہشت گردوں اور انتہا پسندوں کی سرگرمیوں کو مزید برداشت کرتے رہے اور دینی تعلیم کے نام پر فرقہ واریت کے فروغ کو خاموشی سے دیکھتے رہے تو پھر زندگی گزارنے کے لئے عام مسلمان کے سامنے دو ہی راستے رہ جائیں گے یا تو کسی نہ کسی فرقے اور مسلک کے تحت نفرت اور عدم برداشت کا رویہ اختیار کر کے دوسرے فرقوں سے نبرد آزما ہو جائیں اور اپنے آپ کو دنیا سے علیحدہ کر کے وہی زندگی گزاریں جسے افغانستان، صوبہ سرحد اور بلوچستان کے مدرسوں میں تعلیم یافتہ استاد، اسلام کہتے ہیں اور جس میں جدید دور کی کسی سہولت اور سائنسی علوم کی گنجائش نہیں، جس میں ٹیلی ویژن اور ریڈیو کو بجلی کے کھمبوں سے لٹکا کر پھانسیاں دینا سکھایا جاتا ہے، جس میں عورتوں کو ووٹ دینے کا حق نہیں، بیواؤں کو محرم کے بغیر سودا خریدنے کی اجازت نہیں، خواتین ملازمت کے حق سے محروم ہوتی ہیں، انہیں کھیلوں میں حصہ لینے سے روک دیا جاتا ہے حتیٰ کہ مرد بھی نیکریں پہن کر نہیں کھیل سکتے۔ قارئین کو یاد ہو گا طالبان کے دور حکومت میں پاکستان کی ایک فٹ بال ٹیم افغانستان میں نیکریں پہن کر گراؤنڈ میں اتری تو ''اسلامی قوانین'' کے تحت ان کے سر منڈوا دیئے گئے۔ اس طرح کا طرز زندگی اختیار کئے بغیر کسی کو اس معاشرے میں رہنے کا حق حاصل نہیں رہے گا جو ان پابندیوں کو قبول نہیں کرے گا۔

دوسرا راستہ یہ ہو گا کہ نفرت، دہشت اور قبائلی دور کی پسماندہ زندگی سے بچنے کے خواہشمند لوگ یا جیلوں میں چلے جائیں یا حکمران ملاؤں کے متشددانہ قوانین کے مطابق جان سے ہاتھ دھو بیٹھیں اور جس کے پاس وسائل ہوں وہ ان پابندیوں سے نجات حاصل کرنے کے لئے ترک وطن کر جائے جیسے کہ طالبان کے دور حکومت میں

افغان اساتذہ' بیوروکریسی' مڈل کلاس اور تعلیم یافتہ خواتین کی غالب تعداد اپنا وطن چھوڑنے پر مجبور ہوگئی تھی اور جس طرح ایران کے تعلیم یافتہ اور روشن خیال لوگوں کو وطن سے نکلنا پڑا تھا۔ لیکن کیا دنیا مسلمانوں کو مزید برداشت کرنے کے لئے تیار ہے؟ افسوس کہ انتہا پسندوں نے یہ راستے بھی بند کر دیئے ہیں۔ ان لوگوں نے ترقی یافتہ دنیا میں دہشت گردی کی وارداتیں کر کے ان معاشروں میں مسلمانوں کو مشکوک اور اسلام کو ایک شدت پسند مذہب کی حیثیت سے بدنام کر دیا ہے۔ وہی امریکہ جہاں چار سال پہلے اسلام اس ملک کا تیزی سے پھیلتا ہوا مذہب تھا آج وہاں مقامی لوگوں کی اکثریت اسلام اور مسلمان دونوں سے ڈرنے لگی ہے۔ میں امریکہ میں آباد ان بدنصیب مسلمانوں کے مصائب کی تفصیل بیان نہیں کر سکتا کہ وہ بہت طویل ہے صرف اتنا عرض کروں گا کہ عملی طور پر امریکہ جیسے جمہوری اور آزاد خیال معاشرے میں وہ دوسرے درجے کے شہری بن چکے ہیں۔ کسی حساس محکمے میں انہیں ملازمت نہیں ملتی اور جو پہلے سے ملازم ہیں انہیں اہم ذمہ داریوں سے فارغ کر کے کلرکی والے کاموں پر لگا دیا گیا ہے۔ ان کے بچوں کو اسکولوں اور کالجوں میں ہراساں کیا جاتا ہے' یہاں تک کہ تمام پابندیوں سے گزرنے کے بعد اگر کوئی ایسا مسلمان جہاز یا بس میں سوار ہو جائے جو لباس یا کسی دوسری وجہ سے شناخت کیا جا سکتا ہو تو مسافر اس جہاز یا بس میں سفر کرنے سے انکار کر دیتے ہیں۔ امریکہ میں سلامتی کے نئے قوانین اتنے سخت کر دیئے گئے ہیں کہ کسی مسلمان کے لئے آزادانہ زندگی کا تصور اب ختم ہو چکا ہے۔ عالم اسلام اور مسلمانوں کے حوالے سے جب ایک سروے کیا گیا تو نتیجہ یہ سامنے آیا کہ 73 فیصد امریکی اسلام اور مسلمانوں کو خطرناک تصور کرتے ہیں۔ 14 فیصد انہیں ناپسندیدہ قرار نہیں دیتے جبکہ 13 فیصد نے کسی رائے کا اظہار نہیں کیا۔ مسلمانوں سے امریکیوں کے خوف کا یہ عالم ہے کہ جب دبئی کی ایک نجی کمپنی نے امریکہ کی 6 بندرگاہوں کا انتظامی ٹھیکہ لیا تو وہاں شور برپا ہوگیا۔ ڈیموکریٹس کے ساتھ حکمران ری پبلکن پارٹی کے نمائندے بھی سرگرم ہوگئے۔ امریکہ کے آئندہ صدارتی انتخابات میں متوقع امیدوار ہیلری کلنٹن اس مہم میں پیش پیش رہیں اور آخر کار صدر بش کو ذاتی مداخلت کر کے یہ ٹھیکہ منسوخ کرنا پڑا۔ وجہ صرف یہ تھی کہ ٹھیکے لینے والی کمپنی مسلمان اور عرب تھی۔ مسلمانوں سے امریکیوں کے خوف کا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ امریکی قوانین کے مطابق حکومتیں تجارتی معاملات میں مداخلت نہیں کرتیں اور ایسے معاملات میں تو بے حد احتیاط برتی جاتی ہے جہاں نقصان کا اندیشہ ہو۔ عربوں کے ساتھ کئے گئے سودے سے انحراف امریکہ کو کھربوں ڈالر کا نقصان پہنچا سکتا ہے لیکن امریکیوں نے اس کی پروا نہیں کی۔ شاید انہیں معلوم ہے کہ عرب ان کا تجارتی بائیکاٹ کرنے کا حوصلہ نہیں کر سکتے۔

یورپ میں ہر ملک امیگریشن کے قوانین پر نظرثانی کر کے ایسی شرائط لگانے کی کوشش کر رہا ہے جس میں مسلمانوں کا داخلہ قریب قریب ناممکن کر دیا جائے اور وہاں رہنے والے مسلمانوں پر سماجی دباؤ بڑھتا جا رہا ہے۔ برطانیہ جیسے آزاد خیال ملک میں بھی مسلمانوں کی خفیہ نگرانیاں شروع کی جا چکی ہیں۔ اگر پاکستان کے اندر دہشت گردی کے مبینہ مراکز موجود رہے اور معاشرے پر انتہا پسندی کے غلبے میں اضافہ ہوتا رہا تو وہ دن دور نہیں جب ہم ساری دنیا سے کٹ کر رہ جائیں گے اور ہمیں اسلام کے نام پر ایک پسماندہ، غیر مہذب، باہمی نفرتوں سے پُر اور دین کے نام پر قتل و غارت گری سے معمور ماحول میں رہنے پر مجبور ہونا پڑے گا۔ کوئی دوسرا ملک ہمیں اپنی سرزمین پر آنے کی اجازت نہیں دے گا اور کوئی غیر ملکی ہمارے وطن کا رخ نہیں کرے گا۔ ابھی وقت ہے کہ پاکستانی عوام کی غالب اکثریت جو نفرت اور تنگ نظری سے پاک ہے۔ اپنی تہذیب اور اسلام کی حقیقی روح کو بچانے کے لئے جارحانہ انداز میں آگے بڑھے ورنہ انتہا پسند اور دہشت گرد اپنی طرح ہمیں بھی غاروں میں واپس لے جائیں گے۔

(بشکریہ جنگ لاہور، بابت 16 مارچ 2006ء)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

خادم ملک، اوسلو، ناروے۔

گُفت وشنید

آج ہم آپ کو ایک ایسی ہستی سے متعارف کرائیں گے جو ہمہ جہت شخصیت کی مالک ہے۔ ان کے تمام شعبہء زندگی کے گوشوں کو ایک ہی نشست میں متعارف کرانا مشکل ہی نہیں ناممکن ہے اس لئے ہم آج کی نشست میں زیادہ تر ان کے شعبہء ایصالِ ثواب پر ہی روشنی ڈال سکیں گے۔ اور کوشش کریں گے کہ باقی گوشوں پر ان کے خیالات سے بھی مستفید ہوتے رہیں تو سلسلہ گفتگو کا آغاز کرتے ہیں۔

نامہ نگار: جناب آپ کا اسمِ گرامی؟

بندہ ناچیز کو بانی انجمنِ خادمینِ اسلام پیرزادہ سید مخدوم الدین مخدومی کے نام سے پُکارا جاتا ہے لیکن آپ مجھے صرف مخدوم کہہ سکتے ہیں۔

نامہ نگار: شکریہ! اب ہم گفتگو کا سلسلہ شروع کرتے ہیں تو کیا آپ بتائیں گے کہ یہ شعبہء ایصالِ ثواب کیا ہے اور اس کی ضرورت کیوں محسوس ہوئی۔

مخدوم: کچھ زیادہ ہی روشن خیال لگتے ہو یا پھر جان بوجھ کر معصوم بننے کی کوشش کررہے ہو۔ ورنہ یہ الفاظ اتنے متبرک اور زبانِ زدِ عام ہیں کہ پڑھے لکھے تو کُجا ان پڑھ اور گنوار بھی ان الفاظ کے معنی کی تہہ تک پہنچ جاتے ہیں۔ تعجب ہے کہ اس دور میں پڑھے لکھے لوگوں کو بھی ایصالِ ثواب کا مطلب بتانا پڑتا ہے۔ کیا تم نے کبھی ختم شتم نہیں کرایا؟ جہاں تک اس کی ضرورت کا تعلق ہے تو وہ خالص جذبہ ایمانی اور جذبہ خدمتِ انسانی کی بنا پر ہے۔ پھر ہمارا ذریعہ معاش ہی اسلام کی بنیاد پر ہے۔

نامہ نگار: لیکن ختم سے آپ کے گھر میں اتنی بہاریں اور یہ کوٹھیاں اور کاریں چہ معنی دارد؟

مخدوم: ہاں ہاں آپ جیسے لوگ، بالخصوص یہ نوجوان نسل ان چیزوں کو کب سمجھنے اور جاننے کی کوشش کرتے ہیں۔ تو سنو آپ کو علم ہونا چاہیئے کہ قرآن کریم ایک مقدّس کتاب ہے اور اس کے الفاظ ہمارے لئے متبرک اور باعث رحمت ہیں۔ ہمارے مولانا حضرات اور علماء کرام اس بات پر متفق ہیں کہ قرآن کریم کی تلاوت سے نہ صرف ثواب ملتا ہے بلکہ اس کے ایک ایک حرف کے بدلے دس دس نیکیاں ملتی ہیں۔ مثلاً اللہ اکبر کے الفاظ تلاوت کرنے سے اسّی نیکیاں مل

جاتی ہیں۔اس متبرک کتاب کی ایک اور بھی کرامت ہے کہ وہ اَن پڑھ اور جاہل مسلمانوں کو بھی مایوس نہیں کرتی۔اس کے لئے بتایا جاتا ہے کہ اگر آپ کو قرآن کریم پڑھنا نہیں آتا تو اس میں مایوس یا پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔آپ صاف سُتھرے باوضو ہوکر قرآن کریم کو عقیدت سے چوم کر کھولیں اور دائیں سے بائیں اپنی اُنگلی کو الفاظ پر پھیرتے رہیں تو آپ کو بھی حروف کے حساب سے نیکیاں مل جائیں گی۔اس لئے ہمارا بھی یہ یقین ہے کہ تلاوت کلام پاک سے ثواب ملتا ہے اور اسی لئے ہم تلاوت کرتے ہیں اور اس کے حساب سے ہمیں کروڑوں کے حساب سے نیکیاں ملتی ہیں۔پھر یہ سب نیکیاں، ختم، دسویں، چالیسویں اور برسیوں کے دن میز بانوں کے لواحقین جو اس دُنیا سے رحلت فرما چکے ہوتے ہیں ان کی بخشش کے لئے دے دیتے ہیں۔ہماری اس محنت وکاوش کے نتیجے میں احباب ہمیں اچھے اچھے کھانے بھی کھلاتے ہیں اور نذرانہ بھی پیش کرتے ہیں جسے ہم خوشی سے اپنا حق سمجھ کر وصول کرتے ہیں۔ہمارے حفّاظ اکرام دن رات تلاوت میں لگے رہتے ہیں اس لئے قرآن کریم کے بیشمار ختم ہمارے پاس موجود ہوتے ہیں اور ہم ایک دن میں کئی کئی ختم ادا کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

نامہ نگار: یہ جو نذرانہ آپ وصول کرتے ہیں کیا اس کے کوئی فکس ریٹ ہوتے ہیں؟

مخدوم: جی نہیں اس کے کوئی فکس ریٹ نہیں اور نہ ہی ہم اللہ تعالیٰ کے کلام کو بیچتے ہیں، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں فرماتے ہیں کہ میری آیات کو چھوٹی چھوٹی رقم کے بدلے فروخت نہ کرو۔اس لئے ہم اللہ کی آیات کو تھوڑی تھوڑی رقم کے بدلے فروخت نہیں کرتے۔یہ ہماری محنت اور مشقت ہوتی ہے، البتہ آپ بھی اس سے اتفاق کریں گے کہ ایک قرآن کا ختم اور دس قرآنوں کے ختم کا نذرانہ ایک جیسا تو نہیں ہوسکتا؟ میز بانوں کی سہولت کے لئے ہم پہلے ہی ان سے پوچھ لیتے ہیں کہ وہ بتا دیں کہ اپنے لواحقین کو کتنا ثواب پہنچانا ہے اور اسی حساب سے ان سے نذرانہ وصول کرتے ہیں۔آپ یہ سُن کر حیران ہوں گے کہ اس سلسلہ میں ہمیں غریب سے غریب فرد نے بھی کبھی مایوس نہیں کیا۔کھانے میں بھی خوب کھابے، حلوے مانڈے اور کُکڑ شُکڑ بناتے ہیں اور توقع سے بڑھ کر اس معاملہ میں ہمیں خوش کرتے ہیں۔اسی لئے ہم کھانا بھی غریب لوگوں کے گھر ہی کھا لیتے ہیں۔

نامہ نگار: امیر آدمیوں کے گھر میں کھانا کیوں نہیں کھاتے؟

مخدوم: سچی بات تو یہ ہے کہ وہ تو تکلفاً یہ ختم کراتے ہیں لیکن دل سے اس پر یقین نہیں رکھتے۔وہ معاشرتی دباؤ اور محلّہ داری کے خوف سے، اپنی مشہوری یا سیاسی مفاد کی خاطر ان رسوم پر عمل کرتے ہیں۔

نامہ نگار: کسی سیاسی مفاد یا اپنی مشہوری کے لئے ایسا کرتے ہیں وہ کیسے؟

مخدوم: بھئی سیدھی سی بات ہے۔ختم کے بہانے یا تو وہ محلے کے کسی لیڈر کو، یا افسران بالا یا کسی اثر ورسوخ والی آسامی کو مدعو کرتے ہیں' یا پھر سب کو اکٹھا ہی مدعو کر لیتے ہیں اور اس طرح سے ان کی اپنی بھی مشہوری ہو جاتی ہے اور یہ تاثر بھی ملتا ہے کہ اس بندے کے ہاتھ بڑے لمبے ہیں۔

نامہ نگار وہاں تو بڑے پُر تکلف پکوان بنتے ہیں تو پھر وہاں کھانے کے مزے کیوں نہیں لُوٹتے؟

مخدوم: بتایا نہ کہ یہ لوگ تکلفاً ایسا کرتے ہیں۔ختم کے دوران تو تمام ایٹم موجود ہوتے ہیں لیکن دعا کے بعد اچھے اچھے ایٹم میزوں پر سجا دیئے جاتے ہیں اس لئے کہ وہ ہمیں اس بزنس کی وجہ سے دونمبر کا شہری سمجھتے ہیں۔ٹیبلوں تک ہماری رسائی نہیں ہوتی اور نہ ہی ہم اسلاف کی روایات کے خلاف کوئی قدم اٹھاتے ہیں' ان کا بھرم رکھنا اور ان کی شان وشوکت کو قائم رکھنا' ان رسومات کو جاری وساری رکھنا ہمارا مشن ہے' خصوصاً ایسی روایات جن کی وجہ سے ہماری دال روٹی چل رہی ہو۔

نامہ نگار: کیا آپ یہ کام جذبہ خدمت خلق کے تحت فی سبیل اللہ نہیں کر سکتے؟

مخدوم: دیکھئے آج کے دور میں مُفت میں تو موت بھی نہیں ملتی' بلکہ موت سے یاد آیا موت تو شادی بیاہ سے بھی مہنگی ہوگئی ہے۔

نامہ نگار: وہ کیسے؟

مخدوم: شادی بیاہ کے وقت آپ اپنا ایک بجٹ بناتے ہیں جب مطلوبہ رقم آپ کے پاس آ جاتی ہے یا جمع کر لیتے ہیں تو پھر اس کے حساب سے آپ اخراجات کی فہرست بناتے ہیں۔دوسری چیزوں کے علاوہ آپ مہمانوں کی ایک لسٹ تیار کرتے ہیں پھر مینو بنتے ہیں' ایک ایک چیز کا خیال رکھا جاتا ہے تب جا کر شادی بیاہ کا پروگرام کامیاب ہوتا ہے۔لیکن پہلی بات یہ کہ موت پوچھ کر تھوڑا آتی ہے اور پھر اچانک ہی بجلی کی طرح آ جاتی ہے اور یہ خبر جنگل کی آگ کی مانند چاروں طرف پھیل جاتی ہے اور پھر ہر سمت سے بسوں میں، ویگنوں، کاروں اور رکشوں پر افسوس کنندگان جوق در جوق اُمنڈتے چلے آتے ہیں۔اتنی عوام ہو جاتی ہے کہ لواحقین مرنے والے کا غم بھول جاتے ہیں اور ان بن بُلائے مہمانوں کی فکر میں مدغم ہو جاتے ہیں۔لواحقین کو اندازہ نہیں ہوتا کہ کتنے لوگ تشریف لا رہے ہیں اور کون کون کھانا کھا کر جائے گا اور کون نیک اور رحمدل انسان کھانا کھائے بغیر جائے گا۔ایسے نیک اور رحمدل انسان ایک فی صد بھی نہیں ہوتے۔معلوم نہیں گورنمنٹ یہاں کھانے پر پابندی کیوں نہیں لگاتی۔شادی بیاہ تو خوشی کی باتیں ہیں جس کی جیب اجازت دے وہ خوشی سے کھانے کھائے اور کھلائے یا راضی خوشی ویسے ہی وداع کر دے۔لیکن موت تو مرضی سے نہیں آتی۔اور کھانے والوں کا تانتا تو کئی ہفتے تک بندھا رہتا ہے۔اب آپ ہی بتائیں کہ موت

کیا اتنی آسان ہے۔ جب مرنیوالے دن بھی لوگ لواحقین پر رحم نہیں کرتے تو ہم سے رحم کی توقع کیسے کی جاسکتی ہے۔ ویسے بھی گھوڑا گھاس سے دوستی کیسے کرسکتا؟

نامہ نگار: معاف کرنا ابتداً لوگ جذبہ ہمدردی کے تحت اور نیک نیتی سے ایک دوسرے کی مدد کر دیتے تھے۔ آپ لوگوں نے اسے ایک پیشہ بنا کر باقاعدہ ایک کاروبار بنالیا ہے۔آپ کے ذہن میں یہ خیال کب اور کیوں آیا؟

مخدوم: آپ کس دور کی بات کررہے ہیں۔ یہ کاروبار تو پہلے ہی جاری وساری تھا ہم تو اس میں اپنی مجبوریوں کے تحت شامل ہوئے ہیں اور یہ لمبی سٹوری ہے اور نہ آپ لوگ ایسی لمبی سٹوریاں شائع کرتے ہیں۔ اپنی من مانی سے اتنی کانٹ چھانٹ کرتے ہیں کہ اصل کہانی اور اس کا مقصد ہی غائب ہوجاتا ہے۔ پھر کیا فائدہ ایسی سٹوریاں سنانے کا؟

نامہ نگار :نہیں نہیں ! میں وعدہ کرتا ہوں کہ ایسی کانٹ چھانٹ نہیں ہوگی کہ اصل مقصد غائب ہوجائے۔لیکن آپ کو بھی ہماری مجبوریوں کا خیال رکھنا چاہیئے۔

مخدوم: اچھا تو میں پھر کوشش کرتا ہوں کہ کہانی مختصر ہی رہے۔لوسُنو یہ ایک زمانہ پہلے کی بات ہے۔ میں تھوڑا کُند ذہن تھا اس لئے زیادہ تعلیم حاصل نہ کرسکا لیکن صحت بھی اچھی تھی اور شکل وصورت بھی بُری نہ تھی اس لئے مجھے درس میں نہ ڈالا گیا لیکن میرے ایک کلاس فیلو اور دوسرے دو جاننے والے لڑکوں کو ایسی کارکردگی کی وجہ سے درس میں ڈال دیا گیا۔ یہ اُس دور کی بات ہے کہ جب ایسے بچوں کو جن میں کسی نہ کسی چیز کی کمی رہ جاتی تھی اور یہ محسوس کیا جاتا تھا کہ زندگی کی دوڑ میں یہ معاشرے کے دوسرے بچوں کا ساتھ نہ دے سکے گا۔ دوسرے الفاظ میں معذور، کمزور اور کند ذہن بچوں کو درس میں ڈال دیا جاتا تھا۔ یہ دوست کچھ عرصہ بعد درس سے فارغ ہوکر گاؤں واپس آئے تو اس دور میں لوگ حافظ حضرات کی عزت واحترام کرتے تھے اور یار لوگ مذاق وغیرہ بھی کرلیا کرتے تھے۔اب گاؤں میں ایک ہی مسجد تھی اور اس میں اتنے زیادہ حافظوں کی گنجائش موجود نہ تھی۔ انہیں درس والوں نے بھی آفر دی تھی لیکن وہ اُس ماحول میں دوبارہ نہیں جانا چاہتے تھے پہلے تو والدین نے اپنی مرضی سے بلکہ زبردستی بھیج دیا تھا اب بات کچھ اور تھی اور درس کا ماحول ان کا دیکھا بھالا تھا۔ یہ گاؤں کے بچے تھے جہاں کھیتی باڑی سے گھر کا سلسلہ آسانی سے چلتا رہتا ہے۔ گو امیر نہ سہی لیکن کسی کے محتاج نہیں ہوتے اور درس کی تعلیم کے دوران روٹیاں مانگ کر لانا ان کے مزاج کے قطعاً خلاف تھا۔ یہ فعل انہیں اپنے ضمیر کو مجروح کرکے اور بہ امر مجبوری کرنا پڑتا۔اتنے سال درس میں گزارنے کے بعد بھی اس ماحول کے عادی نہ بن سکے۔اب گاؤں میں اپنے اور رشتہ داروں اور پھر جاننے والوں کے ہاں جمعرات کے دن ختم ہوتا تو میں بھی ان تینوں کے ساتھ ہوتا میں گو حافظ نہیں تھا لیکن ناظرہ قرآن اچھی طرح سے پڑھ لیتا تھا۔ختم کے

بعد کُکڑ شُکڑ اور حلوہ ملتا تو ہم اُسی میں خوش تھے لیکن آہستہ آہستہ محسوس ہوا کہ اس طرح کام نہیں چلے گا کچھ نہ کچھ رقم تو جیب میں بھی ہونی چاہیئے کیونکہ مجھے اور ایک دوست کو سگریٹ پینے کی بھی عادت تھی اور سگریٹ تو مُفت نہیں ملتے تھے سگریٹ بھی چوری چھُپے پیتے تھے اس کے لئے تو گھر والوں سے پیسے بھی نہیں مانگ سکتے تھے لہذا جھوٹ بول کر کوئی اور چیز خریدنے کے بہانے پیسے مانگ کر سگریٹ کا خرچا نکلتا تھا اور کیا عیاشی ہوسکتی تھی ؟ بس ہماری عیاشی ختم اور سگریٹ تک محدود تھی ۔ ہماری اکثر محفلیں ہوتیں اور آپس میں کُھلی گپ شپ اور ہنسی مذاق ہوتا تھا لیکن مسجد میں اور ختم کے گھر ہم بہت سنجیدہ اور معقول انسان نظر آتے تھے ۔ ایک دن ہم نے کسی بڑے شہر میں جا کر قسمت آزمائی کا پروگرام بنایا قصہ مختصر اپنی کوششوں سے ہمیں شہر کی ایک تاریک گلی میں ایک تنگ اور تاریک کوٹھڑی کرایہ پر مل گئی ۔ کچھ دیر ادھر اُدھر دھکے کھانے کے بعد اتفاق سے ایک ختم ٹیم سے رابطہ ہوگیا وہ ہمارے تجربہ اور ہماری صلاحیتوں سے متاثر ہوئے اور ہمیں کچھ معاوضہ پر اپنا ساتھی بنانے کی کوشش کرنے لگے ۔ ہم نے فوری ہاں کر کے ان کے ساتھ کچھ دیر کام کیا پھر ہم نے محسوس کیا کہ اب ہم اپنے پاؤں پہ خود کھڑے ہو سکتے ہیں اس لئے ہمیں چاہیئے کہ اپنا بزنس ہو ۔ دوسری ٹیم کے مقابلے میں ہماری صفوں میں اتحاد تھا ہم نے اپنی ایک انجمن خادمینِ اسلام کے نام سے بنائی اور کچھ بندے دوسری ٹیم سے توڑ کر ساتھ ملائے اور کچھ نئے ساتھیوں کو ملا کر اِنڈ پینڈنٹ ہو کر کام کا آغاز کیا ۔ ساتھ ہی ایک بزنس ڈویلپمنٹ مینجر مقرر کیا ہے ۔ اس طرح سے ہمارے کام کا آغاز ہوا اور یہ تھی ہماری مختصر کہانی ۔

نامہ نگار: پھر دس آدمیوں کے اس گروپ سے آپ نے اتنی ترقی کیسے کر لی ؟

مخدوم: کچھ عرصہ پہلے میں نے ممبران کی اس شکایت پہ کہ اب اخراجات بڑھ رہے اور ہماری آمدنی میں خاطر خواہ اضافہ نہ ہوا تو ہمارے لئے اس کاروبار حیات میں شامل رہنا مشکل ہو جائے گا ۔ اس سلسلہ میں ایک تحقیقاتی کمیٹی بنائی گئی ۔ عام طور پر یہ کمیٹیاں بات کو گول مول کرنے یا ٹالنے کے لئے بنائی جاتی ہیں ۔ لیکن ہمارا یہ مقصد نہ تھا اس لئے کہ ہمارا یہ معاملہ فی الواقع ایک سنجیدہ مسئلہ تھا ، لہذا کمیٹی سے یہ سفارش کی گئی کہ وہ اس مسئلہ کا فوری حل نکالے' چونکہ کمیٹی کے اپنے مفادات بھی اس سے وابستہ تھے اس لئے کمیٹی غور و خوض کے بعد اس نتیجہ پر پہنچی کہ اس بزنس کو وسعت اور ترقی دینے کی خاطر مزید برانچیں کھولی جائیں ۔ اس تجویز پر ہم نے فوری قدم اُٹھایا اور پہلے مرحلے میں دس برانچیں کھولیں اور مستقل ممبران میں سے ہر ایک کو ایک ایک برانچ کا انچارج بنا دیا اور ہر ایک انچارج کے زیر نگرانی دس دس ممبر تھے پھر ان سب کا ایک مرکز بنایا تا کہ جتنی آمدنی ہو اس مرکز کے تحت ہو ۔ اس طرح سے ہم 11

سے 121 ہو گئے' پھر 121 سے 1331 پھر 14641۔ اب ہم لاکھوں کی تعداد میں ہیں اور بیرونِ ملک بھی شاخیں موجود ہیں۔ ہم یہ سارا کام نیک نیتی سے کرتے ہیں اس لئے ہمارے اوپر اللہ تعالیٰ اور اُس کے محبوب نبی اکرم ﷺ کا خاص کرم اور نظرِ عنایت ہے۔ اس موقع پر مجھے پنجابی کا وہ شعر یاد آجاتا ہے۔

جے میں ویکھاں عملاں ولوں تے کُج نہیں میرے پلّے
تے جے میں ویکھاں فضلاں ولوں تے بلّے بلّے بلّے

ویسے تو میں کبھی غرور اور تکبّر نہیں کرتا اور ہر حال میں اس کملی والے کا شکر گزار رہتا ہوں، پھر بھی کہنا پڑتا ہے کہ میرے اندر بچپن سے ہی قائدانہ صلاحیتیں موجود تھیں۔ انجمن خادمینِ اسلام میں میری غیر نشو ونما یافتہ صلاحیتیں اور بھی اُبھر اور نکھر کر سامنے آئیں اور ان صلاحیتوں کی بدولت یہ انجمن دن دوگنی اور رات چوگنی ترقی کرتی ہوئی اس مقام تک پہنچ گئی ہے۔ میں اس کا سارا کنٹرول بڑے احسن طریقہ سے چلا رہا ہوں اور لوگ خوش ہیں اور ہر ایک برانچ سے ایک مستقل رقم باقاعدگی سے مرکز تک پہنچتی رہتی ہے۔ ہمارے سارے کارکن ماشاءاللہ بڑے ہی وفادار، جی دار اور جاں نثار صلاحیتوں کے مالک ہیں۔

نامہ نگار: معاف کیجئے گا اس بزنس کے لئے جسے آپ نے اختیار کیا ہے میرے خیال میں اس کے لئے داڑھی کا ہونا ضروری ہے لیکن میں دیکھ رہا ہوں کہ آپ تو بالکل کلین شیو اور بابو ٹائپ لگ رہے ہیں۔

مخدوم: آپ نے درست فرمایا اور ہم بھی اس معاملہ میں سنگین شرائط رکھتے ہیں اور داڑھی جو ہے وہ اولین شرط ہے اس کے بغیر ہم کسی کو بھرتی نہیں کرتے۔ اس کے باوجود اگر کوئی بندہ معقول اور جانثار لگے تو ہم اُسے بھرتی تو کر لیتے ہیں لیکن اُسے سروس جائن کرنے کے لئے اتنی مہلت دیتے ہیں کہ وہ داڑھی بڑھا کر فِٹ فاٹ ہو جائے۔ اس لئے ماشاءاللہ سب لوگوں کی داڑھیاں ہوتی ہیں۔ علاوہ ازیں ہم اُنہیں باقاعدہ ٹریننگ دیتے ہیں کہ کھڑے کیسے ہونا ہے۔ چلنا کیسے ہے اور بیٹھنا کیسے ہے۔ اور کچھ ایسے اصول ہیں جن کی سختی سے پابندی کرائی جاتی ہے اور اس کی خلاف ورزی کرنے والے کا فوری طور پر محاسبہ کیا جاتا ہے۔ مثلاً شرم و حیا، آنکھیں نیچی رکھنا، کسی قسم کا سوال نہ کرنا۔ مذہبی معاملات میں کسی سے گفتگو نہ کرنا۔ دُعا کے دوران کس قسم کی شکلیں بنانا چاہئے یعنی چہرے کے تاثرات کیسے ہونے چاہئے اس کے علاوہ باقی حرکات وسکنات یا یوں کہہ لیں کہ آدابِ ختم کی باقاعدہ ٹریننگ دی جاتی ہے اس لئے کہ یہ کوئی مذاق نہیں ایک سنجیدہ تنظیم ہے۔ اس ٹریننگ میں ہم بدلتے ہوئے حالات کے تحت تبدیلیاں کرتے رہتے ہیں۔

نامہ نگار: تبدیلی کی ضرورت کیوں محسوس ہوتی ہے؟

مخدوم: دیکھیں ہمارے جو کسٹمرز ہیں اُن کی خواہش یہ تھی کہ جو بھی ٹیم اُن کے ہاں آئے، پھٹے پرانے کپڑوں میں

ملبوس ہو، داڑھیوں میں تیل وغیرہ نہ لگا ہوتا کہ بالوں میں چمک نظر نہ آئے اور ویسے بھی دیکھنے میں مسکین نمانے سے نظر آئیں وغیرہ وغیرہ۔ اس سے کسٹمرز معذرت خواہ ہوں میرا خیال ہے یہ لفظ مہذب نہیں اس لئے ہم کسٹمرز کی بجائے لفظ میزبان استعمال کرتے ہیں۔ جی ہاں اس سے ہمارے میزبانوں کو ایک نفسیاتی تقویت ملتی ہے اور انھیں یہ احساس ہوتا ہے کہ ایک تو وہ یہ کام اپنے لواحقین کو ایصالِ ثواب کی خاطر کر رہے اور دوسرا ان غریب نمانوں کی مدد کرنا پُن کا کام ہے۔

نامہ نگار: اب اس میں کیا تبدیلی آئی ہے؟

مخدوم: دیکھیں اسے تبدیلی نہ کہیں بلکہ انقلاب کہیں ،انقلاب۔ وہ ایسے کہ اب یہ اطوار بالکل بدل گئے ہیں۔ اب اس قسم کے لوگوں کو میزبانانِ ختم شریف گھر میں گھسنے نہیں دیتے۔ لوگ ایک سٹینڈرد اور معیار دیکھنا چاہتے ہیں۔ اس لئے ہماری انجمن کی باقاعدہ ایک وردی ہے۔ ہمارے مارکیٹنگ ڈائریکٹر کا یہ آئیڈیا تھا اور اُن کے اس مفید مشورہ پر ہم نے عمل کر کے اس فیلڈ میں خاطر خواہ کامیابی حاصل کی ہے۔ آپ ذرا دیکھیں تو سہی بڑی بارُعب اور پُر شکوہ سی وردی ہے۔ بعض اوقات تو لوگ دھوکا کھا جاتے ہیں وہ سمجھتے ہیں کہ کسی محکمے کے لوگ ہیں کسی کے گھر میں چھاپا پڑنے والا ہے۔ دور کھڑے تاڑتے رہتے ہیں کہ دیکھیں کہ چھاپا کس کے گھر پڑنے والا ہے۔ وردی کا ایک اور بھی فائدہ یہ ہے کہ وردی ایک چلتا پھرتا اشتہار ہے ہماری انجمن کا۔ دیکھو کہیں تم بھی غلط فہمی کا شکار ہو کر ''وردی اُتارو'' کا مطالبہ شروع نہ کر دینا۔ میں پہلے ہی اس غلط فہمی کا ازالہ کر دوں کہ وردی سے مراد انجمن کی یونیفارم ہے۔ ہم اس کے علاوہ ایک اور ٹریننگ دیتے ہیں۔

نامہ نگار: وہ کونسی ٹریننگ ہے جو ابھی رہ گئی ہے؟

مخدوم: یہ بہت ہی سخت قسم کی اور کمپلسری ٹریننگ ہے۔ اس سے ہمارا اصل مقصد برین واش (اس کا ترجمہ خالی کھولی/ خالی کھوپڑی ہے) لیکن اسے ہم برین واش کی بجائے روحانی فیوض کہتے ہیں۔ جی نہیں! فیوز نہیں فیوض جو فیض سے نکلا ہے۔ ہاں ایک بات کا خیال رکھنا کہ جب تم یہ انٹرویو شائع کرو تو اس میں سے برین واشؐ کے الفاظ کاٹ دینا۔ اس لئے کہ اس سے لوگوں کو غلط تاثر ملے گا۔ انجمن کی بدنامی کا ڈر بھی ہے۔ یہ سیکرٹ (راز) ہیں اور انہیں راز ہی رہنے دینا اور نہ ہی اس بات پر ہمیں بلیک میل کرنے کی کوشش کرنا۔ اسلئے کہ ہمیں بھی سب علم ہے کہ یہ ایڈیٹر اور چیف ایڈیٹر حضرات راتوں رات کیسے امیر ہو جاتے ہیں اور اتنے غیر ملکی دورے کیسے افورڈ کرتے ہیں۔

نامہ نگار: یہ برین واش کونسی خُفیہ ٹرینگ ہے؟

مخدوم: برین واش نہیں! روحانی فیوض کی ٹرینگ کے راز ہم یہاں پر فاش کرنے والے نہیں البتہ اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ ان کی سوچ سمجھ کے سارے دروازے بند ہو جائیں

،کسی چیز پہ غور وفکر نہ کرسکیں جو کچھ ہم سکھائیں وہی سیکھیں اس کے علاوہ اور کچھ نہ سیکھیں اور نہ ان چیزوں کے بارے میں سوال کریں نہ اپنے طور پر خُفیہ تحقیق کرتے رہیں۔

نامہ نگار: آپ ایسا کیوں کرتے ہیں۔ کیا عقل وفکر اور سوچ بچار سے کام نہیں لینا چاہیئے؟

مخدوم: دیکھیں یہ بزنس ٹیکٹ ہوتے ہیں جو بزنس کو قائم دائم اور جاری وساری رکھنے کے لئے نہایت ضروری ہوتے ہیں ان کے بغیر آپ کا بستر جلدی گول ہوسکتا ہے اور کون کمبخت چار دن کی چاندنی اور پھر اندھیری رات کی تمنا کرے گا۔ یہ جو پڑھے لکھے اور اپنے آپ کو روشن خیال سمجھتے ہیں نا' ان کے دماغ میں کیوں، کیا اور کس لئے کے جراثیم پڑ جاتے ہیں۔ بات بات پر نُکتہ چینی اور ہر چیز میں کیڑے نکالنا ان کی زندگی کا معمول بن جاتا ہے۔ خود تو کچھ کرتے نہیں جو کوئی دوسرا کچھ کرے اُس پر تنقید ہی تنقید۔ برین واش کی ایک زندہ مثال، یورپ کے ماڈرن کلچر میں پلنے والے نوجوانوں کی ہے۔ میں یورپ میں تھا تو ایک دن جمعہ کی نماز کے دوران ابھی دوسری رکعت کی ابتدا ہی ہوئی تھی' مولانا تلاوت فرما رہے تھے کہ اسی دوران مجھ سے دو یا تین صف پیچھے موبائل پر اس مشہور انڈین گانے کی دُھن بجنا شروع ہوئی: گھر آیا میرا پردیسی پیاس بجھی میری اکھین کی۔۔۔۔۔ دُھن تھی کہ بجتی ہی جارہی تھی۔ میں نے لاکھ کوشش کی کہ میرا دھیان اس طرف نہ جائے لیکن نہ جانے کیوں اس طرف سے دھیان ہٹانا مشکل تھا۔ معلوم ہے آپ تو اسے ایمان کی کمزوری کہیں گے لیکن میں اسے فطری عمل کہوں گا کہ خاموشی کی حالت میں ذرا سی سرسراہٹ بھی آپ کو متوجہ کرتی ہے۔ کوئی کھانس رہا ہو، یا کوئی چھوٹا بچہ رونا شروع کردے، باہر کوئی ٹرک سڑک سے گزرے، کوئی کسی کو آواز دے تو یہ سبھی آوازیں آپ تک پہنچتی ہیں بشرطیکہ آپ بہرے نہ ہوں۔ میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ بہت سے نمازیوں کی حالت میرے جیسی ہوگی۔ وہ نوجوان پہلے تو نماز کے دوران اپنا موبائل بند کرنا بھول گیا تھا اور نہ ہی اب بند کررہا تھا۔ یہ برین واش کی ایک زندہ مثال ہے کہ اس نوجوان کو یہ بتایا گیا کہ نماز کے دوران اگر ہاتھ بندھے ہیں تو انہیں کھولتے نہیں، اگر کھڑے ہیں تو جھکتے نہیں اور وہ نوجوان یہ پوچھنے کی جرأت یا کوشش نہیں کرتا کہ کوئی ایسی ویسی ایمرجینسی ہو جائے تو کیا اُس وقت انسان ضرورت کے تحت ہاتھ کھول سکتا یا جھک سکتا ہے؟ اگر اُس نے یہ سوال کیا ہوتا تو وہ یقیناً اپنا موبائل نماز کے دوران بند کردیتا کہ اس کی وجہ سے دوسرے نمازیوں کی نماز میں خلل پڑ رہا ہے۔ لیکن اس نوجوان کو بچپن سے ایسی ہی تعلیم دی گئی ہوگی کہ مذہب میں سوچنے کی اجازت نہیں۔ اگر سوچو گے تو گمراہ ہوجاؤ گے وغیرہ وغیرہ۔ حالانکہ اس سے ایک دو جمعہ قبل مولانا صاحب نے نماز سے پہلے یہ بتایا بھی تھا کہ نماز کے دوران موبائل بند رکھا کریں اگر آپ موبائل بند کرنا

بھول جائیں اور نماز کے دوران آپ فون بند کر سکتے ہیں اس سے نماز نہیں ٹوٹتی۔ لیکن صاحب کس کس کو بتائیں۔ ایک اور مثال اس لئے کہ اس نوجوان کی تعلیم کا تو ہمیں علم نہیں۔ لیکن ایسی خاتون جو تعلیمیافتہ ہے اور لوگوں کے گھریلو مسائل کو ٹیلیویژن پر حل کرتی ہے۔ یہ خاتون پرائم ٹی وی پر ''ماچس'' پروگرام کی میزبان ہیں اور خاتون کا نظریہ ہے کہ جوڑے تو آسمانوں پر بنتے ہیں، عشق تو ہونا ہوتا ہے کہیں بھی کسی بھی عمر میں ہو جاتا ہے۔ اپنی شادی کے بارے میں کہتی ہیں کہ میں شادی نہیں کروں گی (چاہے آسمان پر جوڑا بنتا رہے)۔ اپنی گواہی آدھی تسلیم کرتی ہیں اور اگر کسی نے ٹی وی پر ہی دوران پروگرام تین بار طلاق طلاق طلاق کہہ دیا تو اسے طلاق تسلیم کر لیتی ہیں۔ اسی لئے پروگرام میں ایک مہمان اپنی بیوی سے کہہ رہا تھا کہ اگر تم نے ایسا کیا تو میں تمہیں طلاق دے دوں گا اور یہی جملہ ایک اور موقع پر اُس نے دوبارہ کہا تو میزبان خاتون کہنے لگیں کہ اب تیسری بار یہ جملہ پروگرام کے بعد کہنا اس لئے کہ میں نہیں چاہتی کہ تم ہمارے پروگرام کے دوران طلاق دو۔ برین واش کی اس قسم کی بے شمار مثالیں موجود ہیں۔ ہمیں بالکل ایسے ہی لوگوں کی ضرورت ہوتی ہے اور یہی تعلیم ہم انہیں دیتے ہیں۔

نامہ نگار: میں سمجھ گیا ہوں۔ آپ کا مقصد ہے جو کچھ آپ کر رہے ہیں اُس پر لوگ اندھے دھند لگے رہیں کوئی یہ سوال نہ کرے کہ جو کچھ آپ کر رہے ہیں اس کا کوئی نتیجہ بھی نکلتا ہے نہیں؟ ٹھیک ہے لگے رہیں۔

مخدوم: مجھے شک ہے بلکہ یقین ہے کہ تمہارے دماغ میں بھی یہ جراثیم موجود ہیں۔ تمہارے جیسے بندے ہماری انجمن کے ممبر قطعاً نہیں بن سکتے اور ایسا کبھی سوچنا بھی نا۔

نامہ نگار: سر میں ایسا نہیں سوچوں گا۔ لیکن میں نے آپ سے ایک سوال کیا تھا کہ آپ کی داڑھی کیوں نہیں؟ آپ نے تو بات کو گول ہی کر دیا۔ آپ صرف اتنا ارشاد فرمانے کی زحمت گوارہ کرتے کہ آپ جواب نہیں دینا چاہتے تو میں دوبارہ سوال کرنے کی گستاخی نہ کرتا۔

مخدوم: ایسی تو کوئی بات نہیں ہے ایک تو تم سوال بہت کرتے ہو بات مکمل بھی نہیں ہونے دیتے اور ایک نیا سوال داغ دیتے ہو تو ایسی صورت میں کوئی نہ کوئی سوال تو رہ جائے گا۔ یوں تو میری داڑھی نہ ہونے پر کبھی کسی نے اعتراض نہیں کیا، بعض اوقات کچھ جاہل گنوار، کم تعلیمیافتہ اور تاریک خیال لوگ طنزاً یہ کہتے ہیں۔ کیا بات ہے آپ جس محبت اور چاہت سے اور خضوع و خشوع کیساتھ اس پیارے انداز سے دعا مانگتے ہیں کہ عجیب سماں طاری ہو جاتا ہے، اگر آپ کی داڑھی بھی ہو تو کیا کہنے۔ ایسے موقع پر میں وہ مشہور محاورہ استعمال کرتا ہوں۔ اوے پاگلو' بیوقوفو داڑھی میں اسلام نہیں ہے۔ تو وہ بڑے زور کا قہقہہ لگا کر خاموش ہو جاتے ہیں۔ میرا جی چاہتا ہے کہ یہ جو خوشی اور راحت انہیں ملی ہے اس کا بھی اجر مانگوں لیکن پھر چھوڑ دیتا ہوں، سوچتا ہوں کچھ نیکیاں تو اپنے نامہ اعمال میں ڈال لوں۔

The **Creative** Artist

By
Aboo B. Rana

==========

The Creative mind that we confront, is not creative deliberately. The artist is not creating purposely; rather creation is the accumulative consequence and oozing of his past observations, experiences and knowledge. His creations therefore is the inherent need of his age. His work is the pulse of common individual, the deep core of which perhaps the commoner is not even himself aware until he comes in contact with creative works.

In painting, for example, we notice the creative artist has something of significance to reveal behind his conventional imagery. Utilizing all the resources nature grants, the creativity of the artist proves itself productive and fertile. The creative individual, being in possession of a receptive mind, while scrutinizing previous knowledge and analytically dissecting the natural phenomenon is expected to culminate art that either his predecessors had overlooked or they were not in the possession of knowledge and required essentials for the creative work.

For the sake of elucidation I would want to mention the sketches of the famous renaissance giant artist – Leonardo da Vinci. Though he created numerous magnificent and miraculous works, incredible and unreal for his contemporaries. Most of them have blown away in the gusting storms of the ages while those that are preserved lead us into the mind of this genius. Indeed to further my statement of the creative process, I shall take the idea he created of the flying man. We find it was centuries later that his flying man idea got wings in reality. Needless to say all credit goes to the Wright brothers of America; by having a meticulous, technical mind and coupled with patience the Wrights worked upon every detail of the idea and triumphantly overcame all barriers, in lifting man above the surface of the earth. They materialized Leonardo's idea of the flying man in concrete form and transformed it into a reality. Discoveries, depending on their magnitude, sometimes need more than a single mind. One mind to discover the first spark, a thought that by itself is no easy a task; another genius realizing the faithfulness of the idea, pursues the thought all the way until it takes shape in a consolidated material form before us.

The art world of today, as in other fields has little similarity with the renaissance centuries, where skilled artists were commissioned by the selected

elite of the society. In common custom the clergy not only dictated the monetary terms but also the subject matter to the artist. The real artists revolted, for the sake of freedom of expression and thus we find their works of art standing the tests of time. The work done on the roof of Sisetine chapel in Italy by Michaelanglo to take one example. In this country there hardly exist any patrons of genuine art. The causes are in the gushing advancement of Information Technology that is shaking all departments of life, making us re-evaluate and change our lifestyles. Even our way of thinking and outlook on life is changing. To divide the work load, and enhance the communication between the artist and the patron, the art dealers and connoisseurs are gaining importance as time goes by. Most artists of today have to satisfy the ego of the art dealer, who in turn has to please the patrons' ego, which varies not only in the subject matter but the demands vary also in the styles and techniques. The average art dealer, in order to gain more importance, monetary gains and various other reasons, is becoming a hindrance for the artist to reach the patron, thereby hamper the artist to assert his or her individuality and freedom. The creative development becomes polluted and stifled in the art dealer market, as it was in the academic art factories of the renaissance period. The artist of today has to learn to please the art dealer, just to prove that the creativity in his works is not just to possess a different style alone. The hard work and concentration of the artist is hence interrupted and the creative process delayed. This definitely is a hard nut to crack. Besides, the average person in all periods, have had little value for tenacity and hard work.

The odds are formidable, the artist in his efforts to convince the art dealers of his works as original will often be stigmatized as plagiarism. This precisely is what is happening in the food searching markets of today, where artists are forced to conform to the demands of the art dealers at the expense of their originalities. In order to save their creative faculties, it has become indispensable for the average artist to have a versatile disposition. In the monstrous, non-imaginative, red-tape environment the odds against the creative artist are magnified a thousand folds. To swim against these currents is to trample ruthlessly and crush the soft petals of creative thought process.

There is a growing tendency to consider and make use of the upcoming, newly created electronic technology. Educating family, friends and people in the comfort of their homes by means of television, radio-sets, tape recorders and other audio-visual accessories. Whatever speed we may reach by means of these gadgets and gizmos, the need for a human dialogue will always live, otherwise we stagnate by sacrificing our emotional needs besides jeopardizing the finer realms of life. Without human dialogues human lives transform into robots, no better than the newly invented machines. A few decades ago we experienced the cultural reaction against mechanization in the form of Hip movements, also known as the flower culture that created a growing demand for

the God forsaken yogis. Forsaking hard earned employments just to live a life without chaos. It is the dirth of human communication and the scarcity of face to face human dialogue which is making people indifferent towards the beauty of life. The invention of computers has made man fragile and lethargic who can no more run a few yards without fainting. The average person has no time to replenish his sapped energies. The energies, which can only be refilled by constructively utilizing his growing awareness. The old standards on which they depended are becoming useless, creating more confusion, consequently compelling man to release his energies, without any balance or beauty in life. This waste of meaningless discharge of energies due to lack of priorities, has always been the perpetual cause of vanishing cultures.

Thousands if not millions of artists graduate every year from the academic institutions every year, all over the world. Imagine how many artists would have gone by unnoticed during the past few centuries, with only a handful of them having left lasting impressions on the coming generations. The struggle and toil of the majority we cannot say have gone in vain though, yet still who gives a damn if the artists of previous centuries were stepping stones for future generations; their mistakes became eye-openers and lessons for posterity. Each one of us longs to watch the fruits of our labours, indeed no one desires to live a life totally of mistakes. The intrinsic vice with almost all artists is changing paths for the sake of curiosity. This mistake or habit has seldom produced constructive consequences. In almost all cases, changing without purpose artists ended in perversion instead of creativity. The cause of perversion lies in the psychological make-up of an artist and thus of the social plexus of which he or she is a product. The perplexities of various complexes from which an artist, or for that matter any person suffers, also find their roots in the social fabric that is woven around that individual.

The Utopian doctors have not yet succeeded in completely purifying themselves from the perverted roots. To keep itself from totally falling into degradation or chaos every culture has to adhere to some frame of orientation. The more rigid a culture, the more atrocious and stone hearted are its people. Most often the stubborn and rigid characteristics are taken for firm convictions, hence a beautiful society is converted into a world of savages. Or the frame of orientation is not strong enough to withstand the dynamics of human characteristics and yet again a flourishing society turns into a lunatic asylum within days. It is these infrastructures that are a matter of controversy and the cause of so many clashes between one ideology and another, between one nation and another. It is to these limitations, the famous writer on art Sir H. Read directs, when he writes that *'the vitality of art seems to depend on the delicate balance between sensibility and whatever intellectual and emotional accretions it derives from the social element in which it is embedded.'* Until and unless the

artist has not cleansed himself from the bigoted conventions with a clear-cut cause, the efforts used in his work of art can never be creative; remaining stagnant, devoid of vitality and dynamism, becoming perverted by not responding to the inherent needs of nature.

These natural needs only crystallize when the artist after submerging himself in nature, emerges with a constructive response. This constructive response is the artists' motivation in his search for that harmony, balance, beauty or whatever other name you may wish to coin. When the search for truth is missing, no activity will make sense, whether the activity is of art or in any other field of human life. Without purpose or sense the deed is sheer nonsense. This pursuit of goal or direction in the activity of art is itself a part of the beautiful, before the artist begins to pursue the truth of beauty. If we say, art is not in need of Truth or beautiful, obviously it only proves that ugliness prevails. The dilemma of struggle for Truth until the struggle itself becomes beautiful, helps in solving the eternal question of wherefrom did Evil enter in the grand programme of Divine Virtue? Surely the privilege to answer this eternal question shall be the last dialogue in this Divine Comedy. Until then, it is wiser to consider ourselves to do our small acts to keep the universal flag of humanity flying. To continue with our task of removing the dust of evil propensities, in order to see the minutest truth behind the façade of glamour.

Taken for granted the reader has agreed upon the fact the activity of art is none other than pursuit of objective beauty. Besides the fact, the essential prerequisites are the maturity of mind and body. While an immature mind shall produce perverted forms of art. A goal orientated and harmonious mind will create beautiful and lasting works that remain a feast to the eyes for centuries to come. As from the pen of John Keats, *"A thing of beauty is a joy for ever."* In order to enjoy beauty we must know where lies the beauty factor in nature. It then becomes incumbent to consider and scrutinize in detail how the different schools of art, from the very beginning of cave age man, evolved from the then existing geographical, political and economic systems. However rudimentary they happen to appear. As human knowledge expands, to know the sources of the origins of art, science is continually reminding us not to omit the psychological factors.

Before we lose track, let us see what our immediate predecessors have to say about art and its origins. Albeit the pendulum of art has been swinging through the ages, to and fro, between the words of Plato and Aristotle. For Plato, art is a harmonical combination of various elements while Aristotle in reaction against his teacher stated that art is for its own sake. All other definitions on art, by thinkers who came afterwards, are corollaries of pioneers of these two extremes. The later definitions in their vagaries, on the contrary, if we read carefully, perhaps, may provide us a clue to the origins of art. Our enigma is art!

Klee a modern artist of the previous century says, “Presumptuous is the artist who does not follow his road to the end. But chosen are those artists who penetrate to the region of that secret place, where primeval power nurtures all evolution.” Another contemporary artist of Klee was Malevich. He wrote in one of his essays, “Familiar recedes even further and further into the background… … The contours of the objective world fade more and more and so it goes, step by step, until finally the world – everything we loved and by which we have lived – becomes lost to sight……No more ‘likeness to reality,’ no idealistic images – nothing, but a desire!”

First of all, how come truth leads us away from itself. Of course, we irrespective of our fields of endeavour are all in search for the Divine canon. However, Malevich is confirming his belief in the meaningless of art. In the end, he writes, it nothing but just – “desire.” To move to a world that is a figment of ones imagination or a world of non-objectivity may perhaps be soothing temporarily; similar to the intoxication of a whiskey. The after effects or hangover hardly needs mentioning. Whatever the arguments, to my knowledge it is only when a person is tired that he begins to lose sight of the objective world and is observed having a sensation of nothingness. Now let us read how art is further defined.

> “The creation of a work of art,” he writes, “must of necessity… ... be accompanied by distortion of the material form. For, therein is nature reborn.”

If that is art. If nature is reborn or an act of creativity lies only by accompanying distortion; the first argument which comes to my meager commonsense is why not to give birth to distorted human babies. Or according to this modern theory of creativity, we must somehow encourage people to invent means whereby women could bear distorted children. For all intents and purposes, the birth of a human baby is also act of creation. And a sublime creation, needless to mention. Even, for the sake of a blunt argument, we do not consider births as a part of creativity, at least, the distorted children that shall grow up to possess irregular forms, shall prove that Malevich theory, of the road leading to non-objectivity is true, by our friends of abstract or non-objective art. And combined with the newly discovered computerized technology, we can play with nature and change the natural forms of all species of birds and animals, as we are already doing with plants and fruits. For ‘therein is nature reborn.’ A world of newly invented weird forms and bizarre shapes, including grotesque human beings. Adding to this the mind of the Prince of Italian writer Machiavelli, we shall indeed have created one hell of a world of our own. And who cares? Some day a fantastically developed, distorted human may discover the ideal shape, man has been creating through the ages. Something akin to the totem poles the primitive cultures worshipped… ….. or perhaps succeed in making a triangular circle.

Are we not living in an age belonging to a decadent civilization? I ought not to have used the word 'civilization.' I fear, very soon we shall be losing sight of civility, when such appalling definitions and reasons about creativity are being given. If by creativity we mean bringing distortions in nature at our whims and caprices for the sake of obtaining a certain kind of 'desire,' whose validity is so transient that it is thwarted with a single jolt of reason. Of course I am unable to present a single piece of art, from the prehistoric cultures to the present, that does not contain a certain amount of distortion, in colours or form, of nature. Yet, I argue, that is not a deliberate attempt. Distortion of nature, can never be the intention of any true artist. The inability of the artist, to present nature in its vastness and magnanimity is the only apparent reason that we find in art. Unfortunately, the fact is the lovers of nature and men of aesthetics shall have to wait for eternity to capture nature with all its grandeur and beauty.

One may easily question, why search for the beauty in art when we think what already exists in nature, or nature in its present form is perfect. Nothing needs to be changed or distorted if it is already perfect. There is no denying in the fact that changing, in other meanings is also distorting. To veer the road that leads to beauty is indeed a change but certainly by no means can also become distortion. In the words of another thinker, "It is a change in changelessness." Or the difference may perhaps become more vivid if I say that a surgeon who removes a diseased organ from the body or amputates a limb is also bringing a change in the body structure. When a sadist or a cruel person chops off a head of the victim, or mutilates a limb, he is also bringing a change. The former enhances in the beauty of life, while the latter is ugly, debilitating and destructive. The former is change, while the latter is distortion.

****

Aboo is a freelance writer, a designer, a painter and a photographer.

==========